توحید مفضل
محمد علی بک ایجنسی
اسلام آباد

انیس الحسن بن محمد انیس بنگش

گلی نمبر 22، جمیل آباد

ٹیلیفون

0313-5022317

بدھ

۱۷ ربیع الاول

۱۴۳۱ھ

03-May-2010

100/-

توحید مفضل

مترجم

مولانا افتخار مرزا

محمد علی بک ایجنسی

اسلام آباد

توحید مُفضّل

مترجم	:	مولانا افتخار مرزا
ناشر	:	محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد
کمپوزنگ	:	سید عاصم عباس نقوی
تعداد اشاعت	:	1000
تاریخ اشاعت	:	نومبر 2009ء
بار اشاعت	:	سوئم

ملنے کے پتہ جات

محمد علی بک ایجنسی

امام بارگاہ امام الصادقؑ، G-9/2 اسلام آباد فون: 0321-5291921

امام بارگاہ یادگار حسینؑ سٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی: 051-2557470

امام بارگاہ مرکزی سرپاک چکوال: 0543-551611

پیش لفظ

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

﴿اول العلم معرفة الجبار و آخر العلم تفويض الامر اليه﴾

تاریخ انسانی کے اس دور جب ہر طرف انسان کی علمی ترقی کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ اور انسان اپنی معلومات اور رموز فطرت سے آگاہی کی بنیاد پر ستاروں پر کمند ڈال رہا ہے اتنا ہی اخلاقی پستی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ اس علمی ترقی نے اخلاقی پستی کے سفر کی رفتار کو اور تیز کر دیا ہے۔ چنانچہ آج کے دور کی انسانی سوسائٹی اپنی تمام تر ظاہری شان و شوکت (نمود و نمائش) کے باوجود ظلم و بربریت، بے حیائی اور اخلاقی پستی میں تمام سابقہ تہذیبوں کو پیچھے چھوڑ چکی ہے اور ظلم کی چکی میں پستی ہوئی مظلوم انسانیت کسی نجات دہندہ کی منتظر ہے۔ اس ظاہری طور پر انتہائی روشن مگر روحانی طور پر انتہائی تاریک دور میں حضرت

رسول اسلام ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہر انسان کے سامنے سوالیہ نشان کے طور پر کھڑا ہے اور اسے خبردار کر رہا ہے کہ اے انسان! تو ابھی تک حقیقت علم کو شناخت نہیں کر سکا۔ علم کائنات میں جاری قوانین فطرت سے آگاہی حاصل کر لینے کا نام نہیں ہے بلکہ علم کی ابتداء اس ذات بابرکت کی عظمت وجلال کی پہچان اور اس کی معرفت حاصل کر لینے کا نام ہے۔ جس نے اپنی قدرت کاملہ کے اظہار کے لئے موجودات کو خلق فرمایا اور انہیں قوانین فطرت کا پابند کر دیا۔

اسی طرح طاقت اس کائنات کے مظاہر فطرت کے بارے میں علم اور ان پر تصرف حاصل کر لینے کا نام نہیں بلکہ انتہائے علم/ طاقت اپنے پیدا کرنے والے کی معرفت حاصل کر لینے کے بعد اپنے ہر ارادہ وعمل کو اس کی رضا کے حصول کیلئے خالص کر دینے کا نام ہے۔ جب انسان علم کی ابتدائی منزل پر قدم نہیں رکھتا اور اپنے پیدا کرنے والے کی معرفت حاصل نہیں کرتا تو وہ اپنے مقصد حیات کو شناخت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنی زندگی کے سفر کی حقیقی منزل کا تعین کر سکتا ہے۔ آج کی پوری انسانی سوسائٹی اسی مرض کا شکار ہے۔ آج کے دور کا انسان وسیلے کو ہدف سمجھ بیٹھا ہے اور اپنی کم علمی کے نتیجے میں ناکامی کو کامیابی سمجھتا ہے۔

اس عالمگیر انسانی بیماری کے علاج اور انسانیت کو جہالت کے تاریک اندھیروں سے نکالنے اور خداوند تبارک وتعالی کی معرفت کے نور سے انسانوں کے قلوب کو منور کرنے کے لئے الحکیم پروردگار نے اپنی بارگاہ کے تعلیم یافتہ طبیبوں کے ذریعے سے حصول معرفت کی راہیں تعلیم فرمائیں۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب فرماتے ہیں:۔

''جو شخص فقط دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتا ہے دنیا کا حسن و جمال اسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یعنی جو شخص دنیا کو دیکھتا ہے دنیا اسے اندھا کر دیتی ہے اور جو شخص دنیا میں دیکھتا ہے دنیا اس کی حقیقت کی طرف راہ

نمائی کرتی ہے۔''

پس جو شخص دنیا میں دیکھتا ہے یعنی مظاہر دنیا میں غور وفکر کرتا ہے دنیا اسے نور بصیرت عطا کرتی ہے۔ اور معرفت پروردگار کا نور اس کے قلب میں اتر جاتا ہے۔

''توحید مفضل'' ایک بہترین کتاب ہے اور طالبان نور کے لئے بہترین روحانی دسترخوان ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی اس گفتگو میں انسانوں کو دنیا میں دیکھنے کا سلیقہ تعلیم فرمایا ہے۔ تا کہ ان راہوں پر سفر کر کے بھٹکی ہوئی انسانیت اپنی منزل کی شناخت حاصل کر سکے۔ اور مستقل کے تاریک اندھیروں میں سفر کرنے کے لئے روشنی اور توانائی حاصل کر سکے۔

یہ کتاب آج کے دور کے ہر انسان کی ضرورت ہے۔ اپنے بچوں کی تربیت کے لئے ہر ماں باپ کی ضرورت ہے۔ قوموں کی تربیت کے لئے ہر درسگاہ کی ضرورت ہے۔

افتخار مرزا

قصر عباس، مورگاہ، راولپنڈی

فہرست

دوسری نشست

تیسری نشست

چوتھی نشست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابن ابی العوجاء (دہریہ) اور فلسفہ توحید

محمد بن سنان روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے مفضل بن عمر نے بیان کیا کہ میں ایک روز عصر کے بعد جناب رسالتمآبؐ کے روضہ میں قبر و منبر کے درمیان بیٹھا ہوا غور کر رہا تھا کہ پروردگار نے ہمارے سید محمد مصطفیٰ ﷺ کو کیا کیا شرف و فضائل عطا فرمائے ہیں جنہیں عوام امت نہیں جانتے اور ان کے غایت فضل و کمال منزلت و عظمت مرتبہ سے ناواقف ہیں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ابن ابی العوجاء (دہریہ اور نیچری آدمی تھا) بھی آ گیا اور اتنے فاصلے پر بیٹھا کہ میں اس کی باتیں سن سکتا تھا۔ پھر اس کے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی آیا اور اس کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھا۔ ابن ابی العوجاء نے یہ گفتگو شروع کی کہ صاحب اس قبر کا کامل عزت تک پہنچ گیا اور شرف و بزرگی کے تمام حصے اس نے پا لیے اور اپنے تمام حالات میں مرتبہ پا گیا۔ اس کے ہمراہی نے کہا ہاں! وہ (محمد مصطفیٰ) ایک فلسفی تھا۔ اس نے بڑے مرتبہ کا دعویٰ کیا اور اس پر ایسے معجزے بھی لایا جن سے عام عقلوں کو حیران کر دیا اور عقلا نے ان کو معلوم کرنے کے لئے فکر کے دریاؤں میں غوطے لگائے، مگر پھر بھی ناکام واپس آئے۔ جب اس کی اس دعوت کو عقلا، فصحاء، خطباء نے مان لیا تو عام طور پر لوگ فوج فوج اس کے دین میں آنے لگے اور جن جن شہروں تک اس کی دعوت نبوت پہنچتی

وہاں وہاں کے عبادت خانوں اور مسجدوں میں ناموس اکبر (خدائے تعالیٰ) کے ساتھ اس کا نام بھی شامل ہو گیا۔ اور بلند آواز سے پکارا جانے لگا۔ اس میں نہ تخصیص خشکی کی ہے نہ دریا کی، نہ پہاڑی ملکوں کی اور نہ ہموار ملکوں کی، اور یہ بلند آواز سے پکارا جانا بھی ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ ہر شب وروز میں پانچ مرتبہ آذان میں مکرر اور پانچ مرتبہ مکرر اقامت میں۔ اس نے اپنا نام خدا کے نام کے ساتھ صرف اس لیے ملایا کہ اس کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہے اور اس کے کام میں خمول نہ ہو۔

ابن ابی العوجاء بولا: ۔ محمد ﷺ کو ذکر چھوڑ، اس کے معاملے میں تو میری عقل حیران ہے اور میری فکر کو رستہ نہیں ملتا۔ اب کچھ اس اصل حال کا ذکر کر جس کے سبب سے محمدؐ کے دین مین لوگ داخل ہو رہے ہیں۔ یعنی پروردگار عالم کا کچھ ذکر کر کہ آیا وہ بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ پھر اس نے اشیاء عالم کی ابتداء کا ذکر کیا کہ کیونکر یہ چیزیں بنیں۔ اور دعوئ یہ پیش کیا کہ یہ چیزیں کسی کی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں کوئی ان کا بنانے والا نہیں کوئی ان کا مدبر و مصلح نہیں بلکہ یہ خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں اور یوں ہی دنیا چلی آتی ہے اور چلی جائے گی۔

مفضل کا دہریہ کو جواب:۔ مفضل کہتے ہیں کہ یہ سن کر مجھے غصہ کے مارے تاب نہ رہی میں نے کہا: اے خدا کے دشمن! خدا کے دین میں کفر کرتا ہے۔ تو نے بالکل اس پیدا کرنے والے کا انکار کر دیا جس نے تجھ کو اس اچھی صورت میں پیدا کیا اور ایسا تیر ابدیہ قرار دیا۔ اور ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل کرتا رہا، یہاں تک کہ تو اس حالت کو پہنچا۔ (یعنی بچہ سے بڑا ہوا۔ بڑھ کر جوان ہوا۔ جوان ہو کر اب اس سن کو پہنچا) رواگر صرف اپنے نفس کے متعلق فکر کرتا اور تیرا لطیف حاسہ تیرے ساتھ صداقت برتتا تو ربوبیت کے آثار اور مصنوعیت کے دلائل تجھ کو خود اپنے نفس میں موجود معلوم ہو جاتے اور خدائے تعالیٰ کے وجود کے شواہد و براہین صاف ظاہر ہوتے۔

دہریہ کی مفضل کو تنبیہ:۔

دہریے نے کہا، میاں اگر تم کچھ گفتگو کر سکتے ہو تو ہم تم سے کلام کریں۔ اگر تمہارے پاس کوئی قائم وثابت دلیل ہو تو ہم اسے مان لیں گے اور اگر تم اہل کلام میں سے نہیں ہو تو تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اگر تم جعفر بن محمد الصادق کے اصحاب میں سے ہو تو ان کا طرز کلام ایسا نہیں ہوتا جیسی تم نے گفتگو کی اور نہ وہ اس طرح کی دلیل سے ہم سے بحث کرتے۔ انہوں نے ہماری باتیں اس سے زیادہ سنی ہیں جو تم نے سنیں۔ لیکن گفتگو میں نہ تو فحش سے کام لیا اور نہ ہی ہم پر جواب دینے میں تعدی اور ظلم کیا۔ اور وہ بہت ہی بردبار، باوقار عقلمند، اور پختہ عقل کے آدمی ہیں۔ نہ تو سختی کرتے ہیں اور نہ ان کو طیش آتا ہے۔ ہماری گفتگو سنتے ہیں اور بہت توجہ سے کان لگاتے ہیں، اور ہماری دلیلوں کو پوچھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم تمام اپنی دلیلیں بیان کر لیتے ہیں اور ہمیں خیال ہوتا ہے کہ اب حضرتؑ کو خاموش کر دیا تو اسی وقت ہماری حجت اور دلیل کو ایک مختصر سے کلام اور معمولی سی دلیل سے باطل کر کے ہمارے اوپر حجت لازم فرماتے ہیں۔ اور ہمارے عذر کو قطع کر دیتے ہیں اور پھر ہم حضرتؑ کے جواب کو رد کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ اگر تم بھی ان کے اصحاب میں سے ہو تو ویسی ہی گفتگو کرو۔

مفضل امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں:

مفضل نے کہا کہ یہ سن کر میں وہاں سے محزون و متفکر نکلا کہ دیکھیے اسلام و اہل اسلام اس فرقے کے کفر کی وجہ سے کیسی بلا میں مبتلا ہوئے ہیں، کہ یہ خدا کو بالکل نہیں مانتے اور جہان کے معطل ہونے کے قائل ہیں اور خدمت میں اپنے آقا صلوات اللہ علیہ کی حاضر ہوا۔ آپؑ نے جو مجھ کو خستہ حال دیکھا تو فرمایا: تمہیں کیا ہو گیا؟ میں نے جو کچھ ان دہریوں

کی باتیں سنی تھیں اور جس جس دلیل سے ان کے کلام کو رد کیا تھا عرض کر دیا۔

حضرتؑ نے فرمایا: میں تم کو باری تعالیٰ جل عز اسمہٗ کی وہ حکمتیں جو تمام عالم میں اور درندوں، بہائم، پرندوں، کیڑوں، مکوڑوں اور ہر قسم کے جانداروں خواہ حیوانات ہوں یا نباتات اور اشجار ثمر دار ہوں یا بے ثمر اور ادنیٰ اور بقولاتِ خوردنی و غیر خوردنی میں ہیں، ایسی بتاؤں گا جس سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کر سکیں اور مومنوں کے دلوں کو اطمینان ہو جائے اور ملحدوں کو حیرت ہو جائے۔ تو میرے پاس کل صبح کے وقت آنا۔

مفضل نے کہا کہ: یہ سن کر میں نہایت خوش و خرم حضرت کے حضور سے واپس آیا اور انتظار کی وجہ سے وہ شب بہت ہی طولانی معلوم ہوئی، کیونکہ مجھے انتظار تھا کہ کسی طرح صبح ہو اور وہ باتیں حضرت سے حاصل کروں جن کا آپ نے وعدہ فرمایا ہے۔ جب صبح ہوئی تو حاضر خدمت ہوا اور اذن طلب کرنے کے بعد حضوری سے مشرف ہو کر با ادب سامنے کھڑا ہوا۔ آپ نے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر آپ اُٹھ کر ایک حجرے کی طرف چلے جس میں اکثر بغرض تخلیہ تشریف رکھتے تھے۔ میں بھی ساتھ ہی اٹھا، آپ نے فرمایا: چلے آؤ۔ میں پیچھے پیچھے چلا۔ آپ داخل حجرہ ہوئے۔ میں بھی داخل ہوا۔ آپ سامنے بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا:

مفضل! گویا میں تم کو دیکھ رہا تھا کہ اس شب گزشتہ میں انتظار کی وجہ سے تم کو کس قدر طولانی رات معلوم ہوئی۔

میں نے عرض کیا، ہاں مولا! ایسا ہی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا مفضل کو درس توحید

امامؑ نے فرمایا مفضل! خداوند کریم موجود تھا اور کوئی چیز اس سے پہلے نہ تھی اور وہ باقی رہے گا اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ پس اسی کے لیے حمد اس بات پر ہے کہ اس نے

ہمیں الہام کیا اور اسی کے لیے شکر ہے اس بات پر کہ اس نے ہم کو عطیہ دیا۔ اس نے ہمیں اعلیٰ علموں کے ساتھ خاص کیا اور روشن علوی مرتبہ کے ساتھ خصوصیت دی اور تمام خلق سے ہمیں اپنے علم کے ساتھ منتخب کیا۔ اور ہمیں ان پر اپنی حکمتیں دے کر امین مقرر کیا۔

مفضل نے کہا: مولا! کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اسے میں لکھتا رہوں؟ اور میں اس وقت اپنے ساتھ سامان کتابت بھی لے کر آیا ہوں۔

امامؑ نے فرمایا: ہاں لکھ لو۔

امامؑ نے ارشاد فرمایا: اے مفضل! شک و شبہ والوں نے مخلوقات کی پیدائش کے اسباب اور اس کی باریکیوں کو نہ جانا اور ان کے فہم و ادراک ان چیزوں کی حکمت اور درستی کے سمجھنے سے قاصر ہیں جو خالقِ عالم جل قدسہ نے اپنی طرح طرح کی مخلوقات خشکی و تری، ہموار اور ناہموار زمینوں میں پیدا کی ہیں وہ اپنے علم کے قصور کی وجہ سے منکر ہو گئے اور اپنی عقل کی کمزوری کی وجہ سے جھٹلانے لگے، دشمنی پر آمادہ ہوئے، یہاں تک کہ اشیائے عالم کے پیدا کیے جانے ہی کے منکر ہو گئے اور اس امر کا دعوےٰ کر دیا کہ یہ تمام چیزیں مہمل و معطل ہیں ان میں کسی کی صناعی نہیں اور نہ کسی مدبر و خالق کی طرف سے کوئی حکمت ہے اور نہ اس نے ان کو کسی مقدار معین پر پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں سے زیادہ برتر ہے جسے وہ بیان کرتے ہیں۔ ”اللہ ان کو قتل کرے، کہاں بہکے چلے جا رہے ہیں۔“ یہ لوگ اپنی گمراہی اور اندھے پن (بے بصیرتی) اور حیرت میں اندھوں کی طرح ہیں جو کسی ایسے گھر میں داخل ہوئے ہوں جس کی بنیاد نہایت مستحکم اور خوبصورت قائم کی گئی ہو اور اس میں اچھے اچھے نفیس فرش بچھے ہوں اور قسم قسم کے کھانے پینے کی اشیاء اور لباس اور ضروری چیزیں اس میں مہیا کی گئی ہوں اور ہر شے درستگی کے ساتھ اپنے موقع و محل پر حکمت و تدبیر اور اندازے کے ساتھ رکھی ہوئی ہو اور وہ اندھے اس مکان میں دائیں بائیں ہاتھ چلا رہے ہوں اور اس

کے کمروں میں مارے مارے پھرتے ہوں، کبھی ان میں سے کوئی کسی چیز کو پا بھی جائے جو اپنے موقع پر رکھی ہوئی ہے اور ضرورت کے لیے مہیا کی گئی ہے اور وہ اس کی غرض کو نہ جانتا ہو کہ یہ اس جگہ کیوں رکھی گئی ہے اور کس لیے مہیا کی گئی ہے اور کس مطلب سے اس طرح بنائی گئی ہے، تو اس پر غصہ کرے اور ناراض ہو اور اس مکان کو اور اس کے بنانے والے کو برا بھلا کہنے لگے (حالانکہ دراصل یہ اس اندھے کی بینائی کا قصور ہے) یہی حال اس فرقے کا ہے جو معاملہ خلقت اور ثبوت صنعت کا انکار کرتے ہیں کیونکہ جب ان کے ذہن ان اسباب اور علتوں کے سمجھنے سے قاصر رہے جو ان اشیاء میں ہیں تو تمام جہاں میں حیران و سرگردان پھرنے لگے اور حسن صنعت اور کمال خلقت اور ان کے مہیا کرنے کی خوبی کو نہ سمجھے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی چیز سے کوئی واقف ہوتا ہے اور اس کے سبب کو نہیں جانتا اور نہ اس کی غرض و احتیاج کو سمجھتا ہو، تو فوراً اس کی مذمت کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے یہ محال ہے اور محض غلط ہے جیسے مانویہ فرقہ (یہ مجوسیوں کا ایک فرقہ مانی نامی ایک شخص کی طرف منسوب ہے جس نے شاپور ابن اردشیر شاہ کے زمانے مین ایک دین و مذہب نیا نکالا تھا، اس کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو نبی ہیں مگر جناب موسیٰ علیہ السلام نبی نہ تھے۔ اور تمام عالم کو دو چیزوں نے پیدا کیا ہے اچھی چیزوں کو تو نور نے پیدا کیا ہے اور درندے وغیرہ موذی چیزوں کو ظلمت نے پیدا کیا ہے۔ یہی دو خدا ہیں جو نفع و ضرر کی چیزوں کے خالق ہیں۔) نے کہا اور نیز اس ملحد سرکش بدکار فرقے نے علانیہ طور پر کہنا شروع کیا ہے اور ان کے علاوہ گمراہوں نے بھی جنہوں نے صرف یہ کہہ دینے سے کہ فلاں چیز محال ہے ناممکن ہے اپنے تیئں خدا سے دور کر دیا ہے۔

پس جس شخص کو اللہ تعالی نے ان چیزون کی معرفت عنایت کی ہو اور اسے اپنے دین کی طرف ہدایت کی ہو اور مخلوقات کی کاری گری کی تدبیر پر غور کرنے اور اس لطیف

اصلاح اور قائم دلیلوں کو عمدہ طور سے بیان کرنے پر جن خوبیوں سے یہ چیزیں پیدا کی گئی ہیں، توفیق دی ہو تو اس پر لازم ہے کہ اللہ تعالی کی جو اس کا مولیٰ ہے اس توفیق عطا ہونے پر بہت حمد کرے اور اس سے اس بات کی خواہش کرے کہ وہ اسے اس معرفت و قوت بیان پر قائم رکھے اور زیادتی معرفت عطا کرے۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے۔

﴿لئن شکرتم لا زیدنکم﴾

''اگر تم میرا شکریہ ادا کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔''

﴿و لئن کفرتم ان عذابی لشدید﴾

''اور اگر تم کفران نعمت کرو گے جان لو کہ میرا عذاب بہت سخت ہے۔''

اے مفضل! اللہ تعالی جل جلالہ، کے وجود پر پہلی عبرت اور دلیل تو یہی ہے کہ عالم کو کس صورت سے بنایا گیا ہے۔ اس کے اجزا کیونکہ ترکیب دیے گئے ہیں۔ کس خوبی سے اس کا نظم و انتظام ہے۔ اگر تم اس جہان کو اپنے فکر سے تامل اور غور کرو اور اپنی عقل سے ہر ایک چیز کو جدا جدا کر کے سمجھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ عالم ایک ایسے مکان کے مانند ہے جس میں تمام وہ چیزیں موجود ہیں جن کی ضرورت بندوں کو واقع ہوتی ہے۔ دیکھو! آسمان تو چھت کی مانند ہے اور زمین ایسی بچھی ہوئی ہے جیسے فرش اور ستارے اس طرح لگے ہوئے ہیں جیسے مکان میں بہت سے چراغ رکھے ہوں اور اپنے اپنے موقع سے روشن ہوتے ہوں اور جواہر اس طرح مخزون ہیں جیسے مکان میں خزانے اور ذخیرے ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ ہر شے اپنی اپنی ضرورت کے لیے تیار و موجود ہے۔ اور حضرت انسان اس جہان میں ایسے ہیں جیسے اس مکان کا مالک اور آقا ہو۔ جس کے قبضہ میں وہ تمام چیزیں ہیں جو اس مکان کے اندر ہیں۔ اور مختلف طرح کے نباتات۔ اپنی اپنی ضرورتوں کے لیے موجود و مہیا

ہیں (کوئی حیوانات کی غذا ہی کے لیے، کوئی انسان کی دوا کے لیے، کوئی محض زینت و آرائش کے لیے، کوئی انسان کو خوشبو پہنچانے اور اس کی تفریح کے لیے، کوئی صرف پرندوں کے لیے، کوئی صرف چرندوں کے لیے وغیرہ وغیرہ) اور قسم قسم کے حیوانات خاص خاص مصلحتوں اور منافع کے لیے صرف کیے گئے ہیں۔

اس حسن ترتیب و تالیف و جمع و توصیف میں صاف کھلی دلیل اس بات پر موجود ہے کہ تمام جہان کسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس نے ایک مقدار معین پر ان کو خلق کیا ان میں حکمتیں قرار دیں۔ ان میں انتظام قائم کیا، ان میں سے ہر ایک کو دوسرے سے مناسبت اور تعلق قرار دیا، اور نیز اس بات پر بھی دلیل ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے جس نے ان کو اس خوبی سے جمع کیا ہے، ترکیب دی ہے، ایک کو دوسرے سے منضم کر دیا ہے[1]۔ (وہ جلیل ہے قدوس ہے، بلندی والا ہے، اس کی ذات کریم ہے اس کے سوا کوئی اللہ نہیں، وہ ان منکروں کی باتوں سے کہیں برتر ہے۔)

انسان کی ابتدائی خلقت کی حکمتیں:۔

اے مفضل! ہم اب تمہارے سامنے انسان کی خلقت کے بیان سے ابتدا کرتے ہیں اس سے عبرت حاصل کرو (دیکھو!) اس انسان کی خلقت کا پہلا مرتبہ (مرحلہ) تو وہ ہے جس سے رحم کے اندر جنین کی اصلاح و تدبیر کی جاتی ہے حالانکہ وہ تین قسم کے پردوں میں بند ہے اور تین قسم کی تاریکیوں میں ہے۔ ایک پیٹ کی تاریکی، دوسرے رحم کا اندھیرا، تیسرے بچہ دان کی تاریکی، اور یہ ایسا وقت ہے کہ بچہ نہ تو اپنی غذا کے لیے کوئی تدبیر کر سکتا ہے اور نہ کسی طرح کی تکلیف کو اپنے سے ہٹا سکتا ہے اور نہ کوئی نفع اپنے لیے حاصل کر سکتا

۱۔ کیونکہ اگر کئی خالق ہوتے تو جہان کا یہ انتظام قائم نہ رہ سکتا اور اتنی مدت تک ایک ہی سلسلہ باقی نہ رہتا ضرور، کچھ نہ کچھ جھگڑا فساد ہوتا اور جہاں میں ابتری پھیلتی۔

ہے اور نہ کسی ضرر کو دفع کر سکتا ہے۔ اس وقت خون حیض اس بچہ کی طرف جاری ہوتا ہے جو اسے غذا پہنچاتا ہے جیسے نباتات کو پانی غذا پہنچاتا ہے اسی طرح یہ اس وقت تک رہتا ہے جب تک اس کی خلقت پوری نہیں ہو لیتی اور اس کے بدن کی جلد مضبوط نہیں ہوتی کہ ہوا کا مقابلہ کر سکے (یعنی ہوا سے اس کو تکلیف نہ پہنچ سکے) اور اس کی آنکھ اس قابل ہو جائے کہ روشنی کو دیکھ سکے جب یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو اس کی ماں کو شدت سے دردزہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کو بہت سخت متحرک اور بے چین کرتا ہے یہاں تک کہ بچہ پیدا ہوتا ہے اور جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ خون جس سے اس کی غذا پیٹ کے اندر ہوتی تھی ماں کے پستان کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے تو اس کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے، اور رنگ بھی بدل جاتا ہے اور وہ کچھ اور ہی قسم کی غذا بن جاتا ہے۔ جو بچے کے مزاج کو نہایت ہی موافق ہوتا ہے بہ نسبت خون کے اور جس وقت اسے ضرورت ہوتی ہے اس وقت اس کو پہنچایا جاتا ہے پس جس وقت وہ پیدا ہوتا ہے اسی وقت ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتا ہے اور لبوں کو حرکت دیتا ہے اس غرض سے کہ اسے دودھ پلایا جائے تو وہ اپنی ماں کی دونوں پستانوں کو ایسا پاتا ہے جیسے دو شربے اس کی خوراک کے لیے لٹکے ہوئے ہیں۔ اسی حیثیت سے برابر دودھ سے غذا پاتا رہتا ہے جب تک اس کا بدن نرم اور اس کی آنتیں و اعضاء رقیق اور کمزور رہتے ہیں۔

دانتوں کی ضرورت اور حکمت:

یہاں تک کہ چلنے پھرنے لگتا ہے اور اسے ایسی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جو سخت ہو، تاکہ اس کا بدن قوی ہو، اس میں طاقت آئے۔ تو اس وقت اس کی داڑھ کے دانت نکلتے ہیں کہ ان سے غذا کی چیز کو چبا سکے تاکہ اس کا ہضم ہونا اس کے لیے آسان ہو جائے۔ پھر اسی طرح غذا کھاتا رہتا ہے۔

داڑھی کی حکمت:

یہاں تک کہ جب جوان ہوتا ہے۔ اگر لڑکا ہو تو اس کے چہرے پر بال نکلتے ہیں تا کہ مرد کی علامت اور مردوں کی عزت اس سے حاصل ہو، جس سے وہ بچپنے کی حد سے اور عورتوں کی مشابہت سے نکل جاتا ہے۔ اور اگر لڑکی ہوئی تو اس کا چہرہ صاف وشفاف رہتا ہے اس پر بال نہیں نکلتے تا کہ تازگی اور حسن اس کا باقی رہے، جس سے مردوں کو اس کی طرف رغبت ہو اور بقائے نسل کا باعث ہو سکے۔

تفصیل بیان گزشتہ:

اے مفضل! ان تمام مختلف حالتوں میں جس شان سے انسان کی تدبیر واصلاح ہوتی رہی ہے کیا تم جان سکتے ہو کہ یونہی بے کسی مدبر اور خالق کے ہوتی رہی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر یہ خون (خون حیض) اس وقت جبکہ وہ (بچہ) رحم میں تھا اس کی طرف جاری نہ کیا جاتا تو کیا وہ ان نباتات کی طرح خشک نہ ہو جاتا جن کو پانی نہیں ملتا۔ اور اگر دردزہ اسے متحرک نہ کرتا اور اس کے پیدا ہونے کے قابل ہو جانے کے بعد اس کو نکلنے کی تحریک نہ دیتا تو کیا وہ رحم میں اسی طرح دفن نہ ہو جاتا جیسے زندہ بچے زمین میں دفن کر دیے جاتے تھے۔ اور اگر ولادت کے وقت اس کے مزاج کے موافق دودھ نہ ملتا تو کیا بھوکا مر نہ جاتا۔ یا ایسی غذا نہ کھاتا جو اس کے موافق مزاج نہ ہو اور اس کے بدن کی اصلاح نہ کر سکے، اور اگر اپنے وقت خاص پر اس کے دانت نہ نکلتے تو کیا اس کو خواش کی چیزیں کھانی اور چبانی اور ان کا ہضم کرنا دشوار نہ ہوتا، یا اسے اسی حالت رضاعت پر باقی نہ رکھتا تو پھر، نہ تو اس کا بدن مضبوط ہوتا، اور نہ وہ کسی کام کے قابل بنتا، اور پھر تو اس کی ماں اسی کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہتی، کسی دوسرے بچے کی تربیت کی اس کو فرصت ہی نہ ملتی۔

اور اگر اس کے چہرے پر اپنے وقت سے بال نہ نکلتے تو کیا بچوں ہی کی ہیئت اور عورتوں ہی کی صورت پر نہ رہ جاتا۔ پھر نہ اس میں کوئی جلالت ہوتی اور نہ وقار ہوتا (جیسے آپ خواجہ سراؤں کو دیکھتے ہیں کہ داڑھی نہ ہونے کی وجہ سے کیا منڈی صورت معلوم ہوتی ہے۔)

مفضل نے کہا: میں نے عرض کیا یا حضرت میں نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو اپنی حالت پر باقی رہ جاتے ہیں ان کی داڑھی نہیں نکلتی اگر چہ وہ بوڑھے بھی ہو جائیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ تو ان کی کرنی کا نتیجہ ہے اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ پس سوائے اس شخص کے جس نے اس انسان کو پیدا کیا۔ جبکہ یہ معدوم تھا اور اس کے وجود کے بعد اس کے تمام مصالح کا خود کارکن بنا وہ کون ہے جو اس کے لیے منتظر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وقتاً فوقتاً اس کے ضروریات کو پورا کرتا رہتا ہے۔

اگر اہمال (بے کسی کے پیدا کیے ہوئے پیدا ہو جاتا) ایسی ایسی تدبیروں کے ہوتے ہوئے بھی ہو سکتا، تو بالقصد پیدا کرنا اور باندازہ معین خلق کرنا غلطی اور محال ہوتے ہوئے بھی ہو سکتا، کیونکہ یہ اہمال کے مخالف ہیں حالانکہ ایسا کہنا نہایت ہی لغو ہے (کہ اصلاح اور درستگی تو بغیر کسی خالق کے ہو جائے اور خرابی و نادرستگی تدبیر وتقدیر خالق کے ہونے سے ہو سکے) اور اس کا کہنے والا جاہل ہے۔ کیونکہ بغیر بنائے ہوئے کسی چیز کا پیدا ہو جانا کبھی ٹھیک اور درست نہ ہوگا اور خرابی وتضاد باہمی انتظام کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ یہ ملحدین جو کچھ کہتے ہیں، اس سے اللہ تعالیٰ بہت برتر ہے۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے کیوں نا سمجھ ہوتا ہے؟

اس کی پہلی حکمت: اگر بچہ بافہم وعقل پیدا ہوتا تو وہ بالکل اس جہاں کو پہچانتا ہی نہیں اور

مدہوش وحیران رہ جاتا، جبکہ وہ ایسی چیزیں دیکھتا جن کو کبھی نہ دیکھا تھا اور اس کے سامنے وہ جہان کی مختلف طرح کی صورتیں بہائم وطیور وغیرہ کی آتیں جیسی اس نے کبھی نہ دیکھی تھیں اور اب جنہیں دم بدم اور روز بروز دیکھتا ہے۔

اے مفضل! اسے یوں سمجھو کہ جیسے کوئی شخص کسی ایک ملک سے قید ہو کر دوسرے ملک میں جائے اور اس کی عقل بھی درست ہو تو دیکھو وہ کیسا حیران و پریشان ہوتا ہے۔ نہ تو جلد وہاں کی گفتگو سیکھ سکتا ہے اور نہ وہاں کے اخلاق وآداب کو قبول کر سکتا ہے۔ بخلاف اس کے جو بچپنے ہی میں جبکہ اس کی عقل کامل نہ ہوئی ہو کسی غیر ملک میں قید کر کے پہنچایا جائے تو بہت جلد وہاں کی زبان، وہاں کے اخلاق وانداز سیکھ لے گا۔ اسی طرح اگر بچہ باعقل وہوش پیدا ہوتا اور یکا یک آنکھ کھولتے ہی اس جہان کی عجیب عجیب چیزیں اور مختلف طرح کی صورتیں اور قسم قسم کے اتفاق واختلاف دیکھتا تو سخت تعجب میں رہتا اور مدت تک اس کی عقل میں یہ بات نہ آتی کہ میں کہاں تھا، کہاں آ گیا اور یہ جسے میں دیکھ رہا ہوں کیا ہے۔ خواب ہے یا بیداری کی حالت میں یہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں۔

دوسری حکمت: پھر اگر وہ باعقل وادراک پیدا ہوتا تو جب اپنے آپ کو دیکھتا کہ کوئی گود میں اٹھائے ہوئے ہے اس کو دودھ پلایا جاتا ہے اسے (بقاعدہ عرب) کپڑے کی پٹیوں میں لپیٹا جاتا ہے، اسے گہوارہ میں لٹایا جاتا ہے (کیونکہ بچوں کے لیے یہ سب باتیں ہونی ضروری ہیں اس سبب سے ابھی اس کا بدن نرم ہے اور مرطوب ہے) تو اسے کیسی نفرت اور ذلت معلوم ہوتی۔

پھر یہ بھی ہے کہ باعقل وہوش پیدا ہونے میں دلوں کو اس سے وہ حلاوت نہ ملتی اور نہ وہ وقعت اس کی لوگوں کو ہوتی جو عام طور پر ناداں بچوں کے کھلانے کدانے سے ہوتی ہے اور ان کے بھولے پن کی وجہ سے دلوں کو ان کی طرف ایک خاص میلان اور رجحان ہوتا

ہے۔

تیسری حکمت: لہذا وہ دنیا میں اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ کچھ سمجھتا نہیں ہوتا۔ بالکل دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے اور تمام چیزوں کو اپنے نہایت کمزور ذہن اور ناقص معرفت سے دیکھتا ہے جس کی وجہ سے اسے کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔

پھر رفتہ رفتہ، وقتاً فوقتاً اس کی عقل اور معرفت بڑھتی رہتی ہے تا کہ وہ آہستہ آہستہ تمام چیزوں سے مانوس ہو جائے اور اس کے ذہن کو مشق حاصل ہو جائے اور پھر اس پر قائم رہے اور اسے غور کرنے کی ضرورت نہ پڑے، نہ اس کو حیرت ہو اور پھر باطمینان اپنی عقل و تدبیر سے معاش حاصل کر سکے۔ اس کی کوشش کر سکے اور عبرت حاصل کرنا اور فرمانبرداری اور بھول چوک اور نافرمانی کو اچھی طرح سمجھ سکے۔

چوتھی حکمت: یہ کہ اگر بچہ باعقل وادراک پیدا ہوتا اور خود اپنے کام کو سمجھ سکتا، تو اولاد کی پرورش کی حلاوت کا محل نہ رہتا، اور وہ مصلحت جس سے والدین اپنی اولاد کے امور میں ہر وقت مصروف ومشغول رہتے ہیں فوت ہو جاتی، اور نہ والدین کی ان پر وہ مہربانی اور عطوفت باقی رہتی جو عام بچوں کی ضرورتوں کے موقع پر ہوتی ہے جس سے وہ ان کے لیے تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔

پانچویں حکمت: یہ کہ نہ اولاد کو ماں باپ سے الفت پیدا ہوتی، اور نہ ماں باپ کو اولاد سے۔ اس لیے کہ جب وہ اپنی عقل کی وجہ سے والدین کی تربیت اور داشت سے مستغنی ہیں تو وہ ان سے وقت ولادت سے ہی الگ ہو جاتے، اولاد، ماں باپ سے اور ماں باپ، اولاد سے۔ پھر تو نہ کوئی شخص اپنی ماں کو پہچانتا، نہ باپ کو اور نہ وہ اپنی ماں، بہن اور باقی محارم سے نکاح کرنے سے (صحبت کرنے سے) پرہیز کرتا، کیونکہ وہ ان کو پہچانتا ہی نہیں۔

چھٹی حکمت: اور کم از کم جو اس میں قباحت ہے حالانکہ وہ سب سے بڑی خرابی ہے اور نہایت مکروہ بات ہے اور وہ یہ کہ اگر بچہ باعقل وادراک و باہوش وحواس، ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا اور وہ اس شئے کو دیکھتا جسے دیکھنا اسے جائز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے کچھ مناسب معلوم ہوتا کہ وہ اسے دیکھے تو اس کی کیا حالت ہوتی؟

اے مفضل! کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس خلقت کی ہر شے کس انتہائی درستگی اور خوبی پر قائم کی گئی ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز اس میں کی غلطی اور خطا سے خالی ہے۔

بچوں کے رونے کی حکمت: دیکھو اے مفضل! بچوں کے رونے میں کیا نفع و فائدہ ہے۔ اس بات کو جانو کہ بچوں کے دماغ میں رطوبت ہوتی ہے، اگر وہ اس میں رہ جائے تو طرح طرح کی مصیبتیں ان پر پڑتیں اور عارضے ان کو لاحق ہوتے۔ مثلاً، آنکھ ہی جاتی رہتی یا اور کوئی بیماری واقع ہو جاتی۔ لہذا رونا، اس رطوبت کو ان کے دماغوں سے بہا دیتا ہے اور اس کے بعد ان کے بدنوں میں صحت پیدا کر دیتا ہے اور ان کی آنکھوں میں سلامتی پیدا کر دیتا ہے۔

کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ بچہ تو رونے سے فائدہ پاتا ہے اور اس کے والدین اس بات کو نہیں سمجھتے اور اس وجہ سے کوشش کرتے ہیں کہ اسے خاموش کریں اور اس کی خوشی کے موافق کام کرتے رہیں تاکہ وہ روئے نہیں، حالانکہ وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ رونا ہی اس کے لیے اچھا ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ بہت سی چیزوں میں ایسی منفعتیں ہوں جنہیں یہ دہریے نہ سمجھتے ہوں۔

اور اگر وہ ان باتوں کو سمجھتے تو صرف اپنی جہالت اور عدم علم کی وجہ سے کسی چیز کی نسبت یہ نہ کہتے کہ اس میں فائدہ نہیں۔ کیونکہ جن باتوں کو یہ منکرین نہیں سمجھتے اسے اہل

معرفت جانتے ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخلوق اس حکمت کو نہیں جانتی اور خالق اسے اچھی طرح جانتا ہے۔

بچوں کی رال بہنے کی حکمت: بچوں کے منہ سے جو رال بہتی ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ رطوبت نکلتی رہتی ہے جو اگر بدن میں رہ جائے تو بڑے بڑے امراض پیدا کرے جیسے تم ان آدمیوں کو دیکھتے ہو جن کے مزاج میں رطوبت زیادہ ہے وہ احمق اور مجنون اور بے عقل ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ اور بہت سے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے فالج ہے، لقوہ ہے یا اس کے مانند امراض ہیں۔ تو خدائے تعالیٰ نے یہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ رطوبت بچپنے ہی میں ان کے منہ کے ذریعے سے بہہ جائے جس سے ان کو بڑے ہونے کے بعد صحت رہے۔ یہ پروردگار نے ان کو ایسی چیز بخشی ہے جس کی حکمت سے یہ ناواقف ہیں اور ان چیزوں میں مہلت دی ہے جسے وہ نہیں جانتے (کہ شاید اب بھی معرفت حاصل کریں اور خداشناس بنیں) اگر یہ لوگ اس کی تمام نعمتوں کو جانتے ہوتے تو کبھی اتنی مدت تک معصیت میں نہ پڑے رہتے۔ پس اسی کے لیے تسبیح اور پاکی ہے۔ کس قدر اس کی نعمت بزرگ ہے اور جو اس کی مخلوقات میں سے اس کے مستحق ہیں یا نہیں مستحق ہیں ان سب پر کیسی کامل نعمت ہے، اور وہ اس سے زیادہ برتر ہے جسے یہ گمراہ کہتے ہیں۔

آلات جماع کی ضرورت و حکمت: اے مفضل! اب ذرا غور کرو کہ جماع کے آلات نر و مادہ میں کیسے مناسب بنائے گئے ہیں نر کے لیے تو ایسا آلہ بنایا گیا ہے جو ابھر سکتا ہے اور بڑھ سکتا ہے۔ تاکہ نطفہ رحم تک پہنچ سکے کیونکہ اسے اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنا نطفہ کسی دوسری چیز میں ڈال سکے (اس لیے کہ نر سے تو بچہ ہو ہی نہیں سکتا لامحالہ اس کی ضرورت ہوئی کہ مادہ کے رحم تک نطفہ پہونچائے، تاکہ بچہ ہو سکے) اور مادہ کو ایک گہرا

ظرف دیا گیا (یعنی رحم) جو دونوں (نر و مادہ) کے نطفوں کو اچھی طرح رکھ سکے اور بچے کا تحمل کرے اور اس کے لیے پھیلتا رہے (جس قدر بچہ بڑھتا رہتا ہے اسی قدر رحم پھیلتا جاتا ہے تا کہ بچے کو تنگی نہ ہو) اور اس کی حفاظت کرے یہاں تک کہ وہ قوی و مستحکم ہو جائے۔ کیا یہ بات کسی باریک بین حکیم کی تدبیر نہیں ہے؟ (اور کیا یہ سب حکمتیں خود بخود پیدا ہو گئی ہیں، اور یہ لطیف مناسبتیں بھی خود بخود ہو گئی ہیں) اللہ تعالیٰ پاک ہے اور مشرکین کے شرک سے برتر ہے۔

جملہ اعضائے جسم کی کیا ضرورت ہے کیوں بنائے گئے ہیں؟

اے مفضل! غور کرو، جسم کے اعضاء میں اور اس امر میں کہ ہر ایک ان میں کس ضرورت کے لیے بنایا گیا ہے اور اس میں کیا اصلاح و تدبیر کی گئی ہے؟ دیکھو! دونوں ہاتھ تو کام کرنے کے لیے ہیں اور دونوں پاؤں چلنے کے لیے اور دونوں آنکھیں راہ دیکھنے کے لیے اور منہ غذا کھانے کے لیے، معدہ ہضم کے لیے، اور جگر غذا کا لب لباب نکال لینے کے لیے (تا کہ اس سے خون صفرا، سودا اور بلغم بنا سکے اور تمام جسم کو تقسیم کرے) اور سوراخ اس لیے کہ ان میں سے فضلہ دفع ہو سکے، اور آنتیں...... ان کی متحمل رہنے کے لیے، اور فرج بقائے نسل کے لیے اور علیٰ ھذا القیاس تمام اعضاء ہیں کہ اگر ان میں غور کرو گے اور اپنی فکر سے کام لو گے تو ہر ایک عضو کو ایسا پاؤ گے کہ وہ کسی خاص کام کے لیے نہایت درستگی اور حکمت کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔

طبیعت فاعل اور خالقِ عالم نہیں ہو سکتی: مفضل نے کہا: میں نے عرض کی آقا! کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ سب باتیں طبیعت سے پیدا ہوئی ہیں اور دراصل یہ طبیعت کا فعل ہے۔ (یعنی جس طرح اس شئے کی طبیعت مقتضی ہوتی ہے ویسے ہی اس کے آلات بن

جاتے ہیں)

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اچھا تو ان سے پوچھو کہ یہ طبیعت جس کے یہ افعال با حکمت و با تدبیر ہیں، آیا وہ علم اور قدرت بھی رکھتی ہے یا محض بے شعور و بے ادراک ہے۔ اس میں نہ قوت ہے نہ علم۔ اگر وہ یہ کہیں کہ اس میں علم اور قدرت ہے تو پھر انہیں خالق کے ماننے سے کیا چیز روکتی ہے؟ (اسی کو تو ہم خالق کہتے ہیں جو علم اور قدرت والا ہو۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کو کسی علم اور قدرت والے نے پیدا کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کا کوئی خالق نہیں، تو جب طبیعت علم و قدرت والی ہوئی اور اس نے یہ افعال با حکمت و تدبیر کیے تو ان اشیاء کی پیدا کرنے والی ہوئی۔ حالانکہ وہ پیدا کرنے والے کو مانتے ہی نہیں) اور اگر وہ یہ کہیں کہ طبیعت بے علم و قدرت کے ایسی ایسی چیزیں پیدا کر دیتی ہے۔ (یعنی نہ وہ جانتی ہے کہ میں کیا کر رہی ہوں اور نہ اسے اس کام کی قدرت ہے جسے وہ کر رہی ہے) اور اس کے کاموں میں اس قسم کی حکمت و تدبیر ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔ (تو چونکہ یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ ایک شئے کو کام کرنے کی قدرت بھی نہ ہو اور نہ اسے اس کام کا ادراک ہو، پھر بھی وہ اس کو کرے)

لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ فعل کسی حکیم پیدا کرنے والے کا ہے اور جسے یہ لوگ طبیعت کہتے ہیں وہ صرف اس کا بنایا ہوا ایک قاعدہ ہے جسے اس نے اپنی مخلوقات میں حکمت سے جاری کر دیا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ہر چیز کو اس کے اسباب اور علت سے پیدا کرے۔) مثلاً پانی سے دانہ اگاتا ہے۔ اگر مینہ نہ برسے تو غلہ نہ پیدا ہو۔ مجامعت زن و شوہر سے بچہ پیدا کرتا ہے اگر مرد و عورت ہم صحبت نہ ہوں اور نطفہ رحم تک نہ جائے تو بچہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ بخارات سے ابر پیدا کرتا ہے۔ اور ابر کو ہوا سے متحرک کرتا ہے تا کہ مینہ (بارش) برسے، اگر یہ نہ ہو تو بارش نہ ہو۔ یہ دہریے اس سے یہ سمجھے کہ دراصل یہی

اسباب وعلل اور طبیعت خالق ہے۔ ان کے علاوہ کوئی اشیائے عالم کا خالق نہیں، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے کیونکہ صرف پانی جو بے روح ہے وہ کس طرح غلہ پیدا کرسکتا ہے جب تک اس میں کوئی اثر دینے والا اثر نہ پیدا کرے۔ اور نطفہ کیونکر بچہ پیدا کرسکتا ہے اگر کوئی حکیم مدبر اس میں یہ قوت پیدا نہ کرے۔ کہ اس کے ایک حصے سے سر بنے اور ایک حصے سے ہاتھ پاؤں بنیں، ایک حصے سے ہڈیاں بنیں، ایک حصے سے قلب وجگر وغیرہ بن سکیں، صرف نطفہ جو ایک بے ادراک چیز ہے وہ کیا کرسکتا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس اور چیزیں بھی ہیں۔)

غذا خوری کے متعلق تدبیریں اور حکمتیں: اے مفضل! ذرا اس بات میں غور کرو کہ بدن کے اندر غذا کیونکر پہنچتی ہے اور اس میں کیا کیا حکمتیں اور تدابیر ہیں۔

دیکھو! کھانا جب معدے میں جاتا ہے تو معدہ اس کو پکاتا ہے اور اس کا لُبِ لُباب جگر کی طرف ان باریک رگوں کے ذریعے سے جو جگر کے اندر جالدار سی بنی ہوئی ہیں پھینک دیتا ہے (جسے اطباء کیموس کہتے ہیں) یہ معدہ مثل مصفی غذا کے بنایا گیا ہے کہ غذا کو صاف کر کے جگر میں بھیجتا رہے تا کہ جگر میں کوئی ایسی چیز نہ پہنچ جائے جو اسے زخمی کردے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ جگر ایک نرم چیز ہے سختی کا تحمل نہیں کرسکتا۔

پھر جگر اس غذائے حاصل شدہ اور لب لباب کو لے لیتا ہے تو وہ ایک نہایت ہی باریک حکمت سے خون بن جاتا ہے اور ان نالیوں (رگوں) کے ذریعے سے تمام بدن میں پہنچ جاتا ہے جو اس کام کے لیے بنائی گئی ہیں جیسے پانی کے لیے نالیاں بنائی جاتی ہیں کہ تمام زمین تک پہنچ جائے۔ (جہاں تک پہنچانا مقصود ہے جیسے آپ کھیتوں میں دیکھتے ہیں باغوں میں کہ ادھر سے ادھر نالیاں بنی ہوئی ہیں اور انہیں چھوٹی چھوٹی نالیوں سے پانی تمام کھیت اور باغ میں پہنچتا ہے) اور فضلہ اور خبیث چیزیں ان مقامات کی طرف بہہ جاتی ہیں جو خاص انہیں فضلات کے جمع کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ (مثلاً مثانہ، امعا، بیخ ران،

بغل وغیرہ)

پس جو کہ از قسم صفرا ہوتا ہے وہ تو پتے میں چلا جاتا ہے اور جو از قسم سودا ہوتا ہے وہ طحال کی طرف اور جو تو نمی اور تری ہوتی ہے وہ مثانے کی طرف بہہ جاتی ہے۔

پس، غور کرو اے مفضل! کہ ترکیب بدن میں کیا حکمت ہوتی ہے اور یہ اعضا کس طرح اپنے اپنے موقعوں قائم کیے گئے ہیں اور یہ ظروف (آنتیں اور مثانہ وغیرہ) کیونکر تیار کیے گئے ہیں کہ فضلوں کو اپنے میں جمع کریں تا کہ تمام بدن میں یہ فضلے نہ پھیل سکیں جس سے جسم میں بیماری اور لاغری پیدا ہو۔

پس مبارک ہے وہ جس نے ایسے اچھے اندازے اور محکم تدبیر سے ان اعضاء کو پیدا کیا اور اسی کے لیے وہ حمد ہے جس کا وہ مستحق اور جس کے لائق ہے۔

مراتب نشونمائے جسم: مفضل نے کہا: میں نے عرض کی مجھ سے اب آپ بدن کا نشونما جو وقتاً فوقتاً اس کے پورے اور کامل ہو جانے تک ہوتا رہتا ہے، بیان فرمایئے۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ پہلا مرتبہ اس نشونما کا وہ ہے جبکہ جنین کی صورت رحم میں بنتی ہے، ایسے وقت میں کہ نہ اس کو آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ کسی کا ہاتھ وہاں تک پہونچ سکتا ہے۔ اور پھر اس کی تدبیر ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کامل آدمی بن کر تمام وہ اعضاء و جوارح و دل و جگر و امعاء و تمام کارکن اعضاء جو ترکیب بدن میں داخل ہیں مثلاً ہڈیاں، گوشت، چربی، مغز، پٹھے، رگیں اور غضاریف ان کو پورا اور کامل کیے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔

پھر جب اس عالم میں آتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ کیونکر وہ مع اپنے تمام اعضا کے نمو کرتا ہے اور بڑھتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی اس صورت اور ہیئت پر باقی رہتا ہے نہ کچھ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے (یعنی نہ اس کے اعضاء میں انفصال ہوتا ہے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ اس میں کوئی جوڑ لگایا گیا یا گوشت کا پیوند کیا گیا اور نہ کوئی جزو زائد اس میں سے نکل جاتا ہے بلکہ بدن اسی

طرح متصل رہتا ہے اور پھر اس میں نشو نما ہوتا رہتا ہے) یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی تک پہونچتا ہے خواہ اس کی عمر دراز ہو یا اپنی مدت عمر اس سے پہلے ہی پوری کر دے۔

کیا یہ نہایت باریک تدبیر اور حکمت نہیں ہے؟ (جسے کسی حکیم مدبّر نے کمال حکمت سے کیا ہے۔)

انسان کے اشرف المخلوقات ہونیکی وجہ: اے مفضل! غور کرو کہ انسان کو اس کی خلقت میں اور بہائم وغیرہ پر کیا فضیلت اور شرف دیا گیا ہے۔ یہ سیدھا اور کھڑا پیدا کیا ہے اور کیسا برابر ہو کر بیٹھا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ تمام چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے لے سکے اور اپنے اعضا سے اسے حاصل کر سکے، کام کرنا اور تدبیر کرنا اسے ممکن ہو، اگر جھکا ہوا اوندھا بنایا گیا ہوتا جیسے چوپائے ہیں تو کبھی اس سے وہ کام نہ ہو سکتے جواب کر سکتا ہے

غور کرو اے مفضل! ان حاسوں کی طرف جو خاص طور پر آدمی میں پیدا کیے گئے ہیں۔ اور ان سے اسے شرافت دی گئی ہے اور دوسروں کو وہ شرف حاصل نہیں (یعنی یہ حاسے جس انداز اور جس ترکیب سے انسان میں ہیں باقی حیوانات میں نہیں ہیں بلکہ دیگر حیوانات کے حاسوں کی ساخت اور ترکیب دوسرے عنوان سے ہے۔)

آنکھیں سر میں کیوں بنائی گئیں: آنکھیں سر میں اس طرح بنائی گئی ہیں جیسے چراغدان پر چراغ رکھا ہوتا ہے تا کہ ہر چیز کو دیکھ سکے۔ یہ آنکھیں سر کے نیچے کے اعضا میں نہیں بنائی گئیں۔ ہاتھوں میں آنکھ نہیں بنائی گئی۔ پاؤں میں نہیں بنا دی گئی جس سے اس کو آفتیں پیش آتیں اور کام کرنے اور حرکت سے وہ باتیں اس میں پیدا ہو جائیں جو اسے بیمار کر دیں اور اس میں اثر کریں اور اسے نقصان پہونچائیں۔

وسط بدن میں آنکھیں نہیں بنائی گئیں جیسے پیٹ، پیٹھ، سینہ وغیرہ ہے۔ کیونکہ اگر

ان مقامات مین آنکھیں بنائی جائیں تو اسے گردش دینا اور چیزوں کو اچک کر دیکھنا دشوار ہوتا۔ تو جبکہ ان اعضاء میں سے کوئی عضو آنکھوں کے لیے مناسب نہ ہوا تو سر ہی اچھا مقام ان حواس کے لیے قرار پایا اور وہ ان حواس کے لیے بمنزلہ صومعہ کے بنایا گیا ہے۔

حاسے پانچ کیوں بنائے گئے؟ کم وبیش کیوں نہ ہوئے؟

پھر حواس (حاسے) پانچ بنائے گئے تا کہ پانچ چیزوں کو محسوس کر سکیں اور محسوسات میں سے کوئی چیز ایسی نہ رہے جسے وہ معلوم نہ کر سکے۔ آنکھیں تو اس لیے بنائی گئی ہین کہ ہر طرح کے رنگ کو معلوم کر لیں پس اگر رنگ موجود ہوتے اور آنکھیں نہ ہوتیں جو انہیں محسوس کریں تو ان رنگوں کے موجود ہونے میں کوئی فائدہ نہ ہوتا (کیونکہ یہ رنگ صرف اس لیے ہیں کہ باہم اشیاء میں ان کی وجہ سے تمایز ہو اور یہ کہ آنکھوں کو ان سے تمیز حاصل ہو یا ان کو دیکھ کر فرحت حاصل کر سکیں۔)

کانوں کی ضرورت: اور کان اس لیے سر میں قرار دیے گئے ہیں کہ آوازوں کو محسوس کر سکیں۔ اگر آوازیں ہوتیں اور کان نہ ہوتے جو انہیں سمجھتے تو آوازیں بالکل بیکار ہوتیں۔

دیگر حاسوں کی احتیاج: علی ہذا القیاس اور حاسوں کو سمجھ لو۔ (مثلاً اگر ذائقہ کی چیزیں موجود ہوتیں اور قوت ذائقہ نہ ہوتی تو یہ تمام مزے بیکار ہوتے۔ اور اگر گرمی، سردی، نرمی، سختی مثلاً موجود ہوتیں اور حاسۂ لامسہ نہ ہوتا تو ان کا وجود بیکار ہوتا۔ اگر خوشبودار چیزیں موجود ہوتیں اور قوتِ شامہ نہ ہوتی تو تمام خوشبوئیں فضول ہوتیں۔)

پھر اس کا عکس بھی اسی طرح ہے کہ اگر آنکھیں ہوں اور دنیا کے رنگ نہ ہوں تو آنکھیں بیکار ہیں، اور اگر کان موجود ہوں اور آوازیں نہ ہوں تو کان کا کوئی فائدہ نہیں۔

تو دیکھو کہ کس طرح ایسا مقدر کر دیا ہے کہ ایک چیز دوسرے کو محسوس و معلوم

کرے۔ اور ہر ایک حواس کے لیے ایک خاص محسوس مقرر کر دیا ہے جو اس میں اپنا عمل
کرے اور ہر محسوس کے واسطے ایک حاسہ بنا دیا ہے جو اسے محسوس کرے (مثلاً آواز صرف
کان ہی سے سنی جا سکتی ہے۔) آنکھ اسے محسوس نہیں کر سکتی۔ آنکھیں صرف رنگوں اور
شکلوں کو دیکھ سکتی ہیں آوازوں کو نہیں سن سکتیں۔ ناک، خوشبو اور بدبو ہی کو محسوس کر سکتی ہے
رنگ اور آواز کا ادراک نہیں کر سکتی اور علیٰ ہٰذا القیاس۔

حاسہ اور محسوسات کے درمیان واسطہ کیونکر قائم ہے؟

اور پھر کچھ چیزیں ان حواس اور محسوسات کے درمیان واسطہ بھی قرار دے دی گئی ہیں جن
کے بغیر حاسہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مثلاً روشنی اور ہوا، کہ اگر روشنی نہ ہو جو رنگ کو آنکھوں کے
سامنے ظاہر کر سکے تو آنکھیں کبھی رنگ کا احساس نہیں کر سکتیں۔ اور اگر ہوا نہ ہو تو جو آواز کو
کانوں تک پہنچاتی ہے تو کان کبھی آواز کا ادراک نہیں کر سکتے۔

تو کیا اے مفضل! جس شخص کی عقل صحیح ہو اور وہ اپنی فکر سے کام لے اس پر یہ
بات چھپی رہ سکتی ہے کہ جو کچھ میں نے تم سے بیان کیا، کہ حواس اس لیے بنائے گئے اور
محسوسات اس طور پر پیدا ہوئے جو ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہیں اور ان کے واسطے کچھ
چیزیں واسطہ بھی قرار دی گئی جن سے حواس کا عمل پورا ہوتا ہے بغیر کسی باخبر باریک
(لطیف) بنانے والے کی تدبیر اور قصد کے بن گئے، اور اس میں کسی خالق کا کچھ اثر نہیں
ہے۔ (کہیں خود بخود ایسے مناسبات اور ایسی حکمتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بھلا طبیعت کیا سمجھ سکتی
ہے کہ آنکھ اس طرح بنائی جائے اور کان اس طرح اور فلاں فلاں چیز فلاں سے محسوس
کرے، اور فلاں چیز فلاں کو، اور یہ بغیر واسطہ اور ذریعے کے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا واسطے بھی پیدا
کر دیے۔ کہیں طبیعت لاشعوریہ سے یہ بات ممکن ہے؟ جب تک کوئی حکیم مدبّر ان باتوں کو
نہایت حکمت و مصلحت کے ساتھ سمجھ کر نہ بنائے۔)

اگر آنکھیں نہ ہوتیں تو کیا کیا نقصان پہنچتے:

غور کرو اے مفضل! اس شخص کے حال پر، جس کی آنکھیں نہیں ہوتیں تو اس کے
کاموں میں کیا خلل پڑتے ہیں۔ نہ تو وہ اپنے پاؤں رکھنے کی جگہ کو دیکھ سکتا ہے (کہ کہاں
قدم پڑا کہاں نہیں، بلندی ہے یا پستی، گڑھا ہے یا غار، وغیرہ وغیرہ) اور نہ اپنے سامنے کی
چیزوں کو دیکھ سکتا ہے اور نہ رنگوں کو دیکھ سکتا ہے۔ اور نہ اچھی بری شکل کو۔ اگر کوئی گڑھا
سامنے آجائے تو اسے نہیں دکھائی دیتا، یا اگر کوئی دشمن تلوار لے کر اس کی طرف بڑھے تو
اسے نہیں معلوم ہوتا۔ اور نہ اس کو تحریر، تجارت اور زیور سازی وغیرہ صنعتوں کے کام کی راہ
معلوم ہوتی ہے۔ (کہ کیونکہ ان کاموں کو کرے) یہاں تک کہ اگر اس کا ذہن (اور
دماغ) کام نہ کرے تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک پتھر پڑا ہوا ہے۔ (البتہ اس کا ذہن اسے
کچھ راہیں بتاتا ہے جس سے بغیر آنکھ کے بھی چل پھر اور کھا، پی سکتا ہے۔)

کان نہ ہوں تو کیا خرابی ہوگی:

علیٰ ہٰذا القیاس، جس کے کان نہ ہوں تو اس کے بہت سے کاموں میں خلل پڑ
جاتا ہے۔ اس کو گفتگو و کلام کا ذائقہ ہی نہیں ملتا، اور نہ دردناک یا طرب انگیز آوازوں کی
لذت اسے محسوس ہوتی ہے اور لوگوں کو اس سے کلام کرنے میں سخت دقت اٹھانی پڑتی ہے،
یہاں تک کہ وہ اس سے تنگ آجاتے ہیں اور وہ لوگوں کی خبریں اور باتیں ہی نہیں سن
سکتا، حالانکہ وہ موجود اور زندہ ہے، جیسے کوئی غائب آدمی خبروں سے ناواقف ہوتا ہے یا جیسے
کوئی مردہ ہے کہ لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتا۔

عقل کا فائدہ:

لیکن جس کی عقل نہ ہو وہ تو بہائم کے مانند ہے بلکہ یہ شخص بہت سی ایسی چیزیں

نہیں سمجھ سکتے گا جسے بہائم سمجھتے اور جان سکتے ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ اعضاء و جوارح اور عقل اور تمام وہ چیزیں جن سے انسان کی اصلاح ہے اور جو ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو کتنا بڑا خلل اور ضرر اس کو پہنچے، کس طرح اس کی خلقت کو کامل بناتی ہیں اور کوئی ان میں سے کسی کامل مجسم انسان سے مفقود نہیں ہوتی تو کیا یہ سب چیزیں بے علم وقدرت و بے اندازہ پیدا ہو گئیں۔ (ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ ضرور کسی مدبر نے علم واندازہ کے ساتھ ان کو بنایا ہے۔)

بعض لوگوں کی اعضاء وجوارح سے محرومی کی وجہ:

مفضل نے کہا کہ: میں نے عرض کی تو پھر بعض آدمیوں میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ان کے بعض اعضاء و جوارح نہیں ہوتے اور ان کو اس سے وہی نقصانات پہنچتے ہیں جنہیں آپؑ نے بیان فرمایا ہے۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ اس شخص کی تادیب وتنبیہ کے لیے ہے جس میں ایسا ہوتا ہے اور نیز غیروں کی تنبیہ اور نصیحت کے لیے، جیسے بادشاہ لوگوں کو سزا دہی اور نصیحت کی غرض سے تنبیہ کرتا ہے اور یہ تنبیہ ان کی بری بھی نہیں سمجھی جاتی (کیونکہ اگر سزا دہی کا قانون اٹھا دیا جائے تو خلقت سرکش ہو جائے) بلکہ ان کی تعریف کی جاتی ہے اور ان کی اس تدبیر کو ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔

پھر جن لوگوں پر یہ بلا پڑتی ہے انہیں مرنے کے بعد اس قدر ثواب ملے گا (بشرطیکہ وہ خدا کا شکر کرتے رہیں اور اس کی طرف رجوع کریں) کہ جس کے سامنے وہ تمام مصیبتیں جو ان اعضاء کے نہ ہونے کی وجہ سے ان پر پڑی ہیں حقیر معلوم ہوں گی، یہاں تک کہ اگر ان کو مرنے کے بعد اختیار دیا جائے تو وہ اس بات کو پسند کریں گے کہ انہیں بلاؤں میں لوٹا دیا جائے تاکہ زیادہ ثواب پائیں۔

سر ایک ہی کیوں پیدا کیا گیا ہے:

غور کرو اے مفضل! ان اعضاء و جوارح میں جو ایک ایک پیدا کیے گئے ہیں اور دو دو۔ اور دیکھو کہ اس میں حکمت کیا ہے اور کیا انداز ہے اور کیا درستگی تدبیر ہے۔؟

دیکھو! سر ان اعضاء میں سے ہے جو ایک ہی پیدا کیا گیا ہے اور انسان کے لیے ہرگز مناسب بھی نہیں تھا کہ اس کے دو یا زیادہ سر بنائے جاتے۔

کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اگر ایک سر کے ساتھ دوسرا سر اور لگا دیا جاتا تو اس پر ایک بوجھ ہو جاتا، حالانکہ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ تمام حاسے جن کی ضرورت انسان کو ہے وہ سب ایک ہی سر میں موجود ہیں۔

پھر اگر دو سر ہوتے تو آدمی کے دو حصے ہو جاتے۔ پس اگر وہ ایک ہی سے گفتگو وغیرہ کرتا تو دوسرا محض بیکار رہتا جس کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر دونوں سے ساتھ ہی ایک ہی قسم کی گفتگو کرتا تو ایک فضول تھا۔ (کیونکہ دونوں سے وہی بات حاصل ہوتی جو ایک ہی سے ممکن تھی۔ پھر دوسرے سے گفتگو کرنے کی کیا ضرورت رہی، محض فضول ہوا۔) اور اگر ایک سے کچھ گفتگو کرتا (مثلاً) اور دوسرے سے کچھ، تو سننے والا یہی نہ سمجھ سکتا کہ کس کی بات قابل قبول ہے اور کس کی نہیں۔ اسی طرح کے اور خلط مبحث واقع ہوتے۔

ہاتھ دو کیوں بنائے گئے؟

اور ہاتھ دو کیوں پیدا کیے گے؟ انسان کے لیے ہرگز بہتر نہ ہوتا اگر اس کے ایک ہی ہاتھ بنایا جاتا، کیونکہ یہ اس کے ان کاموں میں خلل انداز ہوتا جنہیں وہ کرتا ہے اور جن کی اسے ضرورت ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اگر بڑھئی اور معمار کا ایک ہاتھ شل ہو جائے تو وہ اس بات پر قادر نہ ہوگا کہ اپنے پیشے کو انجام دے سکے اور اگر یہ تکلیف کرے گا بھی تو اسے اچھی طرح

مضبوطی کے ساتھ نہ کر سکے گا اور وہ کام ویسا نہ ہوگا۔ کہ جیسا دونوں ہاتھوں سے ہوسکتا، جو اسے اس کام میں مدد دیتے ہیں۔

آواز اور اس کے آلات:

اے مفضل! ذرا سوچو! انسان کی آواز اور کلام اور اس کے آلات کی ساخت کو اور اس معاملہ میں غور کرو۔ دیکھو حنجرہ (جس کی مدد سے آواز پیدا ہوتی ہے) تو ایک نلکی کے مشابہہ ہے۔ جس سے آواز نکلتی ہے اور زبان، ہونٹ اور دانت حرفوں اور آوازوں کے ڈھالنے کا سانچہ ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جس کے دانت گر جاتے ہیں تو اس سے (س) نہیں ادا ہو سکتا، اور جس کے ہونٹ کٹ جائیں اس سے (ف) نہیں نکلتی، اور جس کی زبان موٹی ہو اس سے (ر) نہیں ادا ہوتی، اور بڑا مزمار (جس کو غالباً بین باجا کہتے ہیں) اس سے بہت ہی مشابہہ ہے۔ حنجرہ تو مزمار کی نلی سے مشابہہ ہے اور پھیپھڑا، اس تونبی کے مشابہہ ہے جس کے اندر پھونکتے ہیں، تاکہ ہوا بھرے اور عضلات جو پھیپھڑے کو پکڑے ہوئے ہیں تاکہ آواز نکل سکے وہ ان انگلیوں کے مانند ہے جن سے تونبی کو دباتے ہیں تاکہ ہوا نلی میں آئے اور ہونٹ اور دانت جو حروف اور راگ کو صحیح طریقے سے نکالتے ہیں وہ ان انگلیوں سے مشابہہ ہیں جو مزمار کے منہ میں آتی جاتی ہیں۔ جس سے صفیریں اور راگ پیدا ہوں۔ البتہ یہ بات ہے کہ اگرچہ مخرج آواز کو مزمار سے سمجھاتے ہیں اور تعلیم کے موقع پر مشبہ بہ قرار دیا گیا ہے۔ (یعنی میں نے مخرج صوت کو مزمار سے تشبیہہ دی ہے۔) لیکن دراصل مزمار مشبہ ہے اور مخرج صوت مشبہ بہ ہے۔ جس کے انداز اور ڈھنگ پر یہ باجا بنایا گیا ہے نہ یہ کہ مزمار باجے کو دیکھ کر مخرج صوت بنایا گیا ہے۔

اے مفضل! میں نے تمہارے سامنے جن آلات واعضائے کلام کو بیان کیا ہے وہ

گفتگو اور کلام کے پیدا کرنے اور حرفوں کے درست نکالنے کے لیے کافی ہیں۔ مگر ان میں علاوہ اس میرے بیان کے اور بھی اغراض ہیں۔ مثلاً حنجرہ

حنجرہ کیوں پیدا ہوا:

حنجرہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی راہ سے لطیف ہوا پھیپھڑے تک پہنچ سکے اور دل کو متواتر اور پے در پے آنے والے سانس سے آرام دے جو اگر ایک دم کے لیے بھی ٹھہر جائے تو فوراً انسان مر جائے۔

زبان کیوں پیدا کی گئی

اور زبان اس لیے بنائی گئی ہے کہ کھانوں کا ذائقہ معلوم ہو سکے اور ان میں تمیز کر سکے، ہر ایک ذائقے کو جدا جدا سمجھ سکے۔ میٹھے کو کھٹے سے الگ کر سکے اور خالص ترش کو کھٹے میٹھے سے اور نمکین کو شیریں سے اور اچھے کو برے سے تمیز کرے۔

علاوہ اس کے زبان کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اس سے کھانے اور پانی کے خوشگوار معلوم ہونے میں مدد ملتی ہے۔

دانت کیوں پیدا کیے گئے:

اور دانت غذا کو چباتے ہیں تاکہ وہ نرم ہو جائے اور اس کا ہضم ہونا آسان ہو اور علاوہ بریں دانتوں کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ ہونٹوں کی روک (سہارا) ہیں اور منہ کے اندر ہونٹوں کے چلے جانے کو روکتے ہیں۔ اسے یوں سمجھو کہ تم دیکھتے ہو جس کے دانت گر گئے ہیں ان کے ہونٹ کیسے ڈھل ڈھلے (ڈھیلے ڈھالے) اور متحرک ہوتے ہیں۔

ہونٹوں کی حکمت:

ہونٹوں کے ذریعے سے انسان پانی کو چوس سکتا ہے تاکہ جو پانی پیٹ کے اندر

جائے وہ باندازہ معین اور بالقصد جائے نہ کہ غرغراتا ہوا بہتا ہوا جائے جس سے پینے والے
کے گلے میں پھندا نہ لگے اور زور سے بہہ کر جانے کے سبب سے کسی اندرونی حصہ میں
خراش نہ پڑ جائے۔

پھر علاوہ اس کے یہ دونوں ہونٹ دروازہ کے مشابہہ ہیں جو منہ کو ڈھانکے رہتے
ہیں جب آدمی چاہے بند کرے۔

اے مفضل! ہم نے تم سے یہ بات بیان کر دی کہ ان اعضاء میں کئی طرح کے
فوائد ہیں اور کئی کئی کاموں میں صرف ہوتے ہیں۔ جیسے ایک ہی آلے سے بہت سے کام
لیے جا سکے ہیں مثلاً گینتی جس سے زمین بھی کھودی جا سکتی ہے اور پتھر بھی توڑا جا سکتا ہے۔
اور ہتھوڑا جس سے کیل بھی ٹھونکی جا سکتی ہے اور لوہے کو بھی کوٹ کر باریک بنایا جا سکتا
وغیرہ۔

دماغی حکمتیں:

اگر تم دماغ کو دیکھو تو ایسا پاؤ گے کہ تہہ بہ تہہ بہت سی جھلیوں میں لپٹا ہوا ہے تا کہ
اسے آفتوں سے بچایا جا سکے اور متحرک نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے اوپر ایک کھوپڑی پاؤ
گے۔ جو بمنزلہ خود کے ہے، تا کہ ٹھیس اور دھکے کا صدمہ اسے چورا چورا نہ کر دے جو اکثر سر پر
واقع ہوتا ہے۔

سر کے بالوں کی حکمت:

پھر کھوپڑی کو ایسا پاؤ گے کہ اسے بالوں کا لباس پہنایا گیا ہے جو سر کے لیے بمنزلہ
پوستین کے ہو گیا ہے اور اسے گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتا ہے۔

پس سوائے خالق کے کس نے دماغ میں یہ استحکام دیا اور حفاظت پیدا کی اور کس

نے اس کو احساس کا سرچشمہ بنایا، اور کس نے اسے اس قابل کیا کہ اس کی حد سے زیادہ
حفاظت کی جائے بہ نسبت باقی بدن کے اس کا مرتبہ زیادہ ہونے اور اس کا رتبہ بڑا ہونے
اور اس کا درجہ بلند ہونے کے سبب سے اس کی پوری حفاظت و نگہداشت کی جائے۔

آنکھ کے پپوٹے اور پلکیں:

اے مفضل! آنکھوں کے پپوٹوں پر غور کرو کہ کس طرح یہ آنکھوں کے لیے مثل
پردوں کے بنائے گئے ہیں اور پلکیں مثل ان ڈوروں کے بنائی گئی ہیں جنہیں پکڑ کر پردے کو
اٹھاتے اور چھوڑتے ہیں۔

اور دیکھو! کہ آنکھ کو کس طرح اس گڑھے کے اندر رکھا ہے اور اس پر اس پردے
اور بالوں سے سایہ کیا ہے۔

دل کو سینے میں کیوں رکھا:

اے مفضل! یہ کس نے دل کو سینے کے اندر چھپایا ہے اور اسے وہ چادر اڑھائی
جسے تم جھلی کہہ سکتے ہو اور کس نے اس کی حفاظت پسلیوں اور اس گوشت اور پٹھوں کے
ذریعے سے جو اس کے اوپر ہیں کی ہے تا کہ اس تک کوئی ایسی چیز نہ پہنچے جو اس میں خراش
پیدا کر دے یہ کس نے حلق کے اندر دو سوراخ اس لیے بنائے کہ ایک سے تو آواز نکلے اور یہ
وہ سوراخ ہے جو پھیپھڑے سے قریب ہے اور دوسرے سے جسے مرے کہتے ہیں اور وہ
معدے سے متصل ہے، غذا اندر جا سکے۔

اور کس نے آواز والے سوراخ پر ڈھکنا ڈھانکا ہے جو کھانے کو پھیپھڑے تک
پہنچنے سے روکتا ہے ورنہ آدمی مر جائے۔

یہ کس نے پھیپھڑے کو دل کا پنکھا بنایا ہے جو نہ کبھی تھکتا ہے اور نہ اپنے کام میں

خلل کرتا ہے تاکہ دل میں حرارت جمع نہ ہوجائے جو اس کی ہلاکت کا باعث ہو۔

یہ کس نے پیشاب پائخانے کے سوراخوں میں ڈوریاں لگائی ہیں جو ان دونوں کو روکے اور سمیٹے ہوئے رہے۔ (جیسے کپڑے کے بٹوے میں ڈوری ہوتی ہے کہ جب چاہیں کھول لیں اور جب چاہیں بند کر دیں) تاکہ ہمیشہ بہتے ہی نہ رہیں اور اس سے انسان کی زندگی تلخ ہوجائے۔ علی ہذا القیاس بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں شمار کرنے والا شمار کرسکتا ہے۔ بلکہ جو باتیں احصار وشمار میں نہیں آتیں اور جنہیں آدمی نہیں جانتے وہ اس سے زیادہ ہیں جنہیں وہ جانتے ہیں۔

یہ کس نے معدے کو سخت پٹھوں والا بنایا ہے اور سخت کھانے کے ہضم کے لیے اس کو معین کردیا ہے۔

جگر نرم ورقیق کیوں بنایا:

اور یہ کس نے جگر کو رقیق اور نرم پیدا کیا کہ لطیف اور صاف شدہ غذا کو قبول کر سکے اور ہضم کرے اور معدے کے فعل سے زیادہ لطیف فعل کر سکے۔

کیا یہ سب کام سوائے خدائے قادر مطلق کے اور کوئی کرسکتا ہے؟ کیا یہ تمہارا خیال ہے کہ اہمال وتعطیل بھی ایسا کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ ایک مدبر، حکیم اور قادر کی تدبیر ہے جو تمام چیزوں کو ان کے پیدا کرنے سے پہلے جانتا ہو، جو کسی کام میں عاجز نہ ہو، اور وہ اللہ لطیف وخبیر ہے۔

مختلف اعضاء کی خلقت کی وجوہات:

اے مفضل! غور کرو کہ یہ رقیق مغز ہڈیوں کی نلیوں میں کیوں بحفاظت رکھے گئے ہیں؟ اسی لیے تاکہ نلیاں اس کی حفاظت کرسکیں اور اسے ضائع ہونے سے بچائیں (ورنہ

اگر نلیوں میں نہ رکھا جاتا تو دھوپ اور حرارت آتش سے پگھل کر بہہ جاتا۔ سردی میں نہایت ٹھوس اور سخت ہوجاتا جس سے انسان زندہ نہ رہ سکتا۔) کیونکہ ہڈیوں کے مغز بھی باعث قوت بدن انسان ہیں۔

اور یہ بہنے والا خون کیوں رگوں میں بند کیا گیا ہے، جیسے پانی ظرف میں رکھا جاتا ہے۔ صرف اسی لیے تاکہ رگیں اس کو روکے رکھیں اور وہ بہہ جانے نہ پائے۔

یہ ناخن انگلیوں پر کیوں قرار دیے گئے ہیں۔ اسی لیے تاکہ ان کو صدمے سے محفوظ رکھیں اور کام کرنے میں مدد دیں (اگر انگلیوں پر ناخن نہ ہوتے صرف گوشت ہی گوشت ہوتا تو چٹکی سے کسی چیز کا گرفت کرنا یا اٹھانا سخت دشوار ہوتا۔ قلم کے ذریعے سے لکھنا دشوار ہوتا، سوئی پرونا ناممکن ہوتا۔ (یعنی سوئی دھاگہ پرونا دشوار ہوجاتا))

یہ کان کا اندورنی حصہ قید خانے کی طرح کیوں ٹیڑھا بیڑھا بنایا گیا ہے؟ اسی لیے تا، کہ اس میں آواز جاری ہوسکے اور اس پردے تک پہنچ جائے جس سے آواز سنائی دیتی ہے اور نیز اس لیے کہ ہوا کی تیزی کا زور ٹوٹ جائے تاکہ پردہ سماعت میں خراش نہ ڈالے۔

یہ آدمی کی رانوں اور سرین پر گوشت کیوں چڑھایا گیا ہے؟ اسی لیے تاکہ اسے زمین کی تکلیف سے بچائے اور سرین پر بیٹھنے سے اس کو تکلیف نہ ہو، جیسے اس شخص کو بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے جس کا جسم دبلا اور گوشت کم ہوگیا ہو، اور اس کے اور زمین کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل نہ ہو جو زمین کی سختی سے اس کو بچائے۔ (مثلاً گدہ۔ مسند وغیرہ)

انسان کی دو قسمیں مرد اور عورت کیوں ہوئیں؟

کس نے انسان کو مرد اور عورت بنا کر پیدا کیا؟ اسی نے نا، جس نے اس کو نسل بڑھانے والا بنایا (کیونکہ ان دونوں مختلف صنفوں کا وجود صرف اس لیے ہے کہ ان کے اجتماع وصحبت سے نسل انسانی بڑھتی رہے اور قائم رہے۔) اور کس نے اس کو نسل بڑھانے

والا بنایا ہے؟ اسی نے نا، جس نے اس کو امید والا پیدا کیا ہے، (کیونکہ انسان اپنی نسل کے قائم رہنے کی صرف اسی لیے کوشش کرتا ہے کہ اس کا نام باقی رہے ورنہ اگر یہ خیال نہ ہوتا اور انسان کے دل میں یہ آرزو نہ ہوتی تو کیوں ایک دوسرے سے ہم صحبت ہوتے۔)

دیکھو ان جانوروں کو جن کی نسل کی بقا صحبت و جماع پر موقوف نہیں ہے بلکہ مادہ کے جمع ہونے اور اس میں ایک خاص قوت پہنچ جانے سے پیدائش واقع ہوتی ہے ان میں نر اور مادہ کا سائز بالکل نہیں ہوتا کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ان میں مادہ کونسی ہے اور کون سی نر ہے؟

انسان کو کام کے آلات کیوں دیے گئے:

اور کس نے اسے آلات عمل دیے؟ اسی نے نا، جس نے اس کو کام کرنے والا بنایا اور کس نے اس کو کام کرنے والا بنایا؟ اسی نے نا، جس نے اس کو صاحب احتیاج پیدا کیا (اگر آدمی کو کسی قسم کی احتیاج نہ ہوتی تو مزدوری کیوں کرتا، حرفت وصنعت کیوں کرتا، اگر اسے جسم کو گرمی اور سردی سے بچانے کی ضرورت نہ ہوتی تو کیوں سیتا، سوئی کیوں بناتا، ڈورے کیوں درست کرتا، کپڑے کیوں بنتا، روئی کیوں کاتتا، کپاس کیوں بوتا، مثلاً اور جب یہ نہ ہوتا تو آلات عمل، ہاتھ، پاؤں، انگلیاں وغیرہ بھی بے کار تھیں۔) اور کس نے اسے صاحب احتیاج پیدا کیا۔ اسی نے نا، جس نے اس کے لیے احتیاج کے اسباب پیدا کیے، اور کس نے اس کے لیے احتیاج کے اسباب پیدا کیے؟ اسی نے نا، جس نے اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری کی۔

انسان کو فہم کیوں دی گئی؟

کس نے اس کو بافہم بنایا؟ اسی نے نا، جس نے اس کے لیے جزا و سزا بھی لازم کی (کیونکہ اگر جزا و سزا اس پر لازم نہ کی جاتی تو اس میں سمجھ وفہم ہونے کی ضرورت ہی نہ

تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیدا کرنے سے پہلے اس کے پیدا کرنے والے نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کے متعلق سزا و جزا کی جائے گی۔ لہذا اس کو عقل اور سمجھ بھی دی، تاکہ نیک و بد کو سمجھ سکے اور نیکی کا بدلہ نیک اور بدی کا بدلہ بد قرار پائے۔)

دیکھو جن مخلوقات کے لیے سزا و جزا نہیں قرار دی گئی ہے۔ ان کو کسی نیک و بد کا احساس ہی نہیں ہے اور نہ وہ جانتے ہیں کہ یہ فعل حرام ہے، نہ وہ جانتے ہیں کہ یہ حلال ہے اور نہ انہیں مکروہ کی تمیز ہے نہ انہیں واجب کا علم۔ سوائے اس کے کہ جس چیز کی ضرورت ان کے بقائے صنف یا بقائے شخص میں ہے اس کو البتہ پہچانتے اور جانتے ہیں۔ مثلاً پرندہ اس قدر ضرور سمجھ رکھتا ہے کہ باز اس کو شکار کرے گا۔ لہذا، اس کی صورت دیکھتے ہی تیز پروازی سے کام لیتا ہے۔ یا ایک ہرن، مثلاً خوب جانتا ہے کہ شیر اسے پھاڑ کھائے گا۔ لہذا اس کی شکل ہی دیکھ کر فرار ہو جاتا ہے۔)

انسان کو تدبیر کرنی کس نے بتائی؟

کس نے اس کو حیلہ و تدبیر عنایت کی اسی نے نا، جس نے اسے قوت بخشی اور کس نے اسے قوت دی اسی نے نا، جس نے اس پر حجت لازم کی (اگر اتمام حجت نہ مقصود ہوتا تو قوت دینے کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ اب البتہ یہ بات پوچھی جا سکتی ہے کہ ہم نے تو تم کو اٹھنے بیٹھنے کی قوت دے دی تھی پھر تم نے مثلاً نماز کیوں نہ پڑھی یا تمہارے ہاتھ پاؤں میں طاقت دے دی تھی تم نے فلاں گرتے ہوئے آدمی کو دوڑ کر کیوں نہ بچایا۔ ان کاموں میں کون اس کی مدد کرتا ہے، جن میں اس کی تدبیر کچھ کارگر نہیں ہوتی، وہی نا، جس کا انتہائے شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ سبحان اللہ کس انداز کا کلام ہے اور کیا لطیف تعلیم ہے۔ **اللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ۔**

مفضل غور کرو اور سوچو جو کچھ میں نے تم سے بیان کیا ہے۔ کیا بغیر بنائے بن

جاتے ہیں یہ نظم ونسق اور یہ ترتیب ہو سکتی ہے (ہرگز نہیں) تعالی اللہ عما یصفون (اللہ تعالی اس سے زیادہ برتر ہے جو یہ لوگ کہتے ہیں)

دل کی حکمتیں اور اس کے سوراخ پھیپھڑے کے سوراخوں کے سامنے کیوں ہیں؟

اے مفضل! اب میں تم سے کچھ دل کا حال بیان کرتا ہوں، جان لو کہ اس میں بہت سے سوراخ (باریک مسامات) ان سوراخوں کے سامنے ہیں جو پھیپھڑے میں واقع ہیں جو کہ دل کا پنکھا ہے۔ (دل کی گرمی اور بخارات کو دور کرتا رہتا اور اسے آرام دیتا رہتا ہے) اگر یہ سوراخ ہٹ جائیں اور ایک دوسرے کے سامنے نہ رہیں تو کبھی ہوا دل میں نہ پہنچ سکے اور انسان مر جائے۔ کیا کسی باعقل وہوش آدمی کی عقل اجازت دے سکتی ہے کہ وہ اس بات کا دعوٰے کرے کہ یہ ترکیب بغیر بنائے خود بخود بن گئی، اور کیا اس کا دل اسے اس بات کے کہنے سے نہ روکے گا؟ (یا اس کا نفس اس بات کی گواہی نہ دے گا کہ ایسا کہنا بے عقلی کی بات ہے۔)

اے مفضل! اگر تم دروازے کے دو کواڑوں میں سے ایک کو دیکھو جس میں کنڈا لگا ہو۔ تو کیا تم کو یہ خیال ہوگا کہ یہ یوں ہی بنایا گیا ہے؟ بلکہ تم یقیناً اس بات کو جان لوگے کہ وہ بنایا ہوا ہے اور کسی دوسرے کواڑ سے ملایا جائے گا.......... تاکہ ان دونوں کے اجتماع سے کسی قسم کا فائدہ ہو۔

اسی طرح تم نر حیوان کو پاؤ گے کہ وہ کسی جوڑے کا ایک فرد ہے جو مادہ لے لیے بنایا گیا ہے تاکہ دونوں ہم صحبت ہوں اس لیے کہ اس میں بقائے نسل ہے۔ (اسی جسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے مدبر حکیم نے نہایت دانائی سے سمجھ کر کہ مرد کو مردانہ آلات دیے جائیں

اور عورت کو زنانہ، تاکہ دونوں کے اجتماع سے بقائے نسل رہے ورنہ صرف مادہ میں یہ تمیز کہاں تھی کہ ایسا سمجھ کر مرد اور عورت علیحدہ علیحدہ بناتا اور ہر ایک کے لیے اس کے مناسب آلات پیدا کرتا۔)

پس اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرے جو فلسفی بننے کا دعوٰی کرتے ہیں پھر کیوں کر ان کے دل اس عجیب وغریب خلقت اور ساخت کے دیکھنے سے اندھے ہو گئے ہیں جس سے انہوں نے انکار کر دیا کہ خلقت عالم میں کسی مدبر کی تدبیر ہی نہیں اور کسی ارادے والے کا ارادہ ہی نہیں (بلکہ جہان آپ ہی آپ پیدا ہو گیا ہے۔)

دیکھو! اگر مرد کا عضوِ تناسل مسترخی ہوتا تو کیونکر رحم کے قعر تک پہنچ سکتا، اور کیونکر اس میں نطفہ ڈال سکتا۔ اور اگر ہمیشہ ایستادہ ہی رہتا تو آدمی کیسے بچھونے پر کروٹ لیتا اور مجمع میں کیونکر چل سکتا، جبکہ ایک چیز اس کے آگے تنی ہوئی کھڑی رہتی۔ (تو معلوم ہوا کہ کسی حکیم نے خاص حکمت سے اس عضو کو ایسا پیدا کیا ہے کہ صرف ضرورت کے قوت تو ایستادہ ہو ورنہ باقی اوقات میں سمٹا رہے تاکہ مذکورہ بالا فوائد حاصل ہو سکیں۔)

پھر علاوہ بدہیبت اور بدنما ہونے کے اس میں ایک خرابی یہ بھی ہوتی کہ ہر وقت مرد اور عورتوں کی شہوت میں تحریک پیدا ہوتی رہتی۔ تو اللہ جل اسمہٗ نے ایسا بنا دیا کہ اس کا زیادہ حصہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے نہ رہے اور نہ مرد کو اس میں کچھ زحمت ہو۔ بلکہ صرف ضرورت کے وقت اس میں سیدھے کھڑے ہو جانے کی قوت دی گئی۔ کیونکہ یہ مقدر کر دیا گیا ہے کہ اس میں نسل کا دوام اور بقاء ہے۔

اے مفضل! ذرا عبرت کی نگاہ سے دیکھو کہ انسان کے کھانے پینے اور اس کی تکلیف کے باآسانی دفع ہو جانے میں کتنی بڑی نعمت پروردگار عالم کی ہے۔ کیا کسی مکان کے بنانے میں یہ خوبی انداز نہیں ہے کہ بیت الخلاء ایسے مقام پر بنایا جائے جو محفوظ جگہ

ہو؟ تو اسی طرح اللہ تعالی نے اس سوراخ کو جو خلاء (رفع حاجت) کے واسطے انسان کے لیے بنایا ہے وہ بھی اس کے ایسے مقام پر قرار دیا ہے جو بہت ہی پوشیدہ ہے اسے کھلا ہوا اور ظاہر اس کے پیچھے نہیں بنایا اور نہ ابھرا ہوا، اس کے سامنے، بلکہ وہ بدن کے ایک پوشیدہ حصے میں مخفی و مستتر اور باپردہ واقع ہے جس پر دونوں رانیں ملی ہوئی ہیں اور دونوں سرین اپنے گوشت سے اسے چھپائے ہوئے ہیں۔ جب آدمی کو رفع حاجت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس خاص نشست سے بیٹھتا ہے تو اس کا وہ مقعد جاری ہوتا ہے اور ثقل کے دفع کے لیے تیار ہوجاتا ہے (ورنہ بند رہتا ہے) فتبارک اللہ من تظاهرت الأئه و لا تحصٰی نعمائه

ڈاڑھ کے دانتوں کی حکمت:

اے مفضل! ان ڈاڑھ کے دانتوں پر غور کرو جو آدمی کے منہ میں بنائے گئے ہیں۔ بعض تو تیز ہیں جو غذا اور طعام کو کاٹنے اور کترنے کا کام کرتے ہیں۔ اور بعض چوڑے ہیں جو چبانے اور ریزہ ریزہ کرنے کا کام دیتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے دانتوں کی چونکہ اسے ضرورت تھی لہذا اس میں کمی نہیں کی گئی۔ (کیا طبیعت لاشعور یہ بھی یہ بات سمجھ سکتی ہے کہ آدمی کے واسطے ایسی ضرورت پڑے گی، لہذا اس کے لیے ایسے دانت بنانے چاہئیں۔ کیا اس میں یہ ادراک و تمیز ہے؟)

بالوں اور ناخنوں کی حکمتیں:

غور کرو اور سمجھو کہ بالوں اور ناخنوں کا منڈنا اور کٹنا کیوں بہتر ہے اور اس میں کیا حکمت ہے۔ چونکہ یہ دونوں بڑھتے اور زیادہ ہوتے رہتے ہیں اس لیے ضرورت پڑی کہ اس کے اوپر اوپر کے حصے میں تخفیف کی جائے۔ لہذا یہ بے حس بنائے گئے تا کہ آدمی کو اس

کے کٹوانے میں تکلیف نہ ہو اور اگر بال و ناخن کے کترنے میں تکلیف محسوس ہوتی تو آدمی دو قسم کی زحمتوں کے درمیان پھنس جاتا، یا تو چھوڑ دیتا کہ بڑھا کریں، تو حد سے زیادہ بڑھ جاتے اور اسے بار معلوم ہوتا، یا کٹواتا تو اسے تکلیف محسوس ہوتی۔

مفضل کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی تو ایسے کیوں نہ بنائے گئے کہ بڑھتے ہی نہیں، کہ انسان کو اس کو کٹانے کی ضرورت پڑے۔

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالی و تبارک کی بندوں پر اس امر میں بہت نعمتیں ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے، اگر جانتے تو اس پر خدا کا شکریہ ادا کرتے۔

معلوم کرو کہ بدن کے امراض و تکالیف انہی بالوں کے ذریعے سے دفع ہوتے ہیں جو اپنے مسامات سے نکلتے ہیں (بخارات اور پسینے انہی مسامات سے نکلتے ہیں، خود یہ بال بھی وہی بخارات ہیں جو تحت الجلد متھلیس ہوتے ہیں) اور انگلیوں کے امراض ان ناخنوں کے ذریعے سے دفع ہوتے ہیں اسی لیے تو نورہ لگانے، سر منڈانے، ناخن ترشوانے کا ہر ہفتہ میں حکم دیا گیا ہے۔ تا کہ بال اور ناخن جلد جلد نکلیں اور بیماریاں ان کے نکلنے سے دفع ہوں، اور جب یہ بڑھ جاتے ہیں تو امراض آلام متحیر رہ جاتے ہیں اور کم نکلتے ہیں تو بیماریاں بدن میں محتبس ہو جاتی ہیں اور وہ طرح طرح کے درد اور امراض پیدا کرتی ہیں۔

اور باوجود اس کے ان مقامات میں بال نہ اگنے دیے جہاں انسان کو نقصان پہنچتا۔ اگر آنکھوں کے اندر بال اگتے تو کیا وہ اندھا نہ ہو جاتا؟ اور اگر منہ کے اندر بال نکلتے تو کیا اس کے کھانے پینے میں لقمہ اور پانی نہ رکتا اگر ہتھیلیوں میں بال پیدا ہوتے تو کیا اس میں قوت لامسہ کو نہ روکتے، اور کیا اچھی طرح چھو کر دریافت کرنے سے باز نہ رکھتے، اور بعض کاموں میں خلل انداز نہ ہوتے؟ اور اگر عورت کی فرج میں بال اگتے یا مرد کے عضو تناسل پر، تو کیا ان کی لذت مجامعت کو نہ کھو دیتے؟

تو دیکھو! کہ کیونکر ان مقامات میں بال نہ پیدا ہوئے۔ کیونکہ اس میں مصلحت تھی ۔(کیا طبیعت بھی ان حکمتوں کو سمجھ سکتی ہے؟ یا اس طرح کے افعال با حکمت طبیعت کی طرف منسوب کیے جا سکتے ہیں؟ افسوس ان دہریوں پر اور ان کی نافہمی پر۔)........ پھر یہ بات کچھ انسان ہی میں خاص نہیں، بلکہ بہائم اور درندوں اور تمام ان جانوروں میں بھی ایسا ہی پاؤ گے جن کی نسل کا بڑھنا صحبت پر موقوف ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ ان کے تمام جسم تو بالوں سے ڈھانکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور خاص یہ مقامات اس سے خالی ہوتے ہیں۔ اس میں بھی تو یہی سبب ہے۔ پس غور کرو اس خلقت کے معاملے کو دیکھو کہ کس کس طرح غلطی اور ضرر کے طریقوں سے بچایا ہے اور کس کس طرح ٹھیک درست اور بانفع پیدا کیا ہے۔

ان مانایوں (مانوی ایک فرقہ ہے مجوسیوں کا جو حکیم مانی کی طرف منسوب ہے) اور ان کے امثال نے جب یہ کوشش کی کہ پیدائش (عالم میں) اور بقصد وارادہ پیدا ہونے میں عیب نکالیں تو انہوں نے یہ عیب نکالا کہ پیڑو پر اور بغلوں کے نیچے بال کیوں پیدا ہوئے، اور اس بات کو نہ سمجھے کہ یہ اس رطوبت کی وجہ سے ہے جو ان مقامات کی طرف بہہ کر آتی ہے۔ اس سبب سے وہاں بال پیدا ہوتے ہیں، جیسے پانی کے جمع ہونے کے مقامات میں گھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا تم ان مقامات کو نہیں دیکھتے بہ نسبت اور مقامات کے کہ کس قدر ان فضلات کے جمع کرنے کے لیے آمادہ ہیں اور انہیں پوشیدہ رکھتے ہیں (یعنی کس قدر پیڑو کے نیچے رطوبت جمع رہتی ہیں۔)

پھر ان میں بھی حکمت ہے کہ جہاں آدمی کو اپنے بدن کے متعلق کچھ مشقت اور تکلیف اٹھانی پڑتی ہے، ان مشقتوں میں سے ایک یہ بھی قرار دی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں مصلحت ہے اس لیے کہ جتنی دیر وہ اپنے بدن کی صفائی اور بالوں کے دور کرنے میں مصروف رہے گا، اتنی ہی دیر اپنے حرص وظلم اور نخوت (اشر) اور بیہودگی سے بچا رہے گا۔

اور ان امور کا اس کو موقع نہ ملے گا۔

لعاب دہن کی حکمت:

اے مفضل! غور کرو لعاب دہن (تھوک) پر اور دیکھو کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ یہ ایسا بنایا گیا ہے کہ ہر وقت منہ کے اندر جاری رہتا ہے تا کہ حلق اور تالو کو تر رکھے کہ یہ خشک ہونے نہ پائیں، کیونکہ اگر تالو اور منہ خشک رہتے تو آدمی مر جاتا اور پھر یہ بھی ہوتا کہ کھانا بھی نہ کھا سکتا۔ جبکہ منہ میں وہ رطوبت ہی نہ ہوتی جو اسے اندر کی طرف لے جائے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے جس پر مشاہدہ خواہ گواہ ہے اور جانو کہ رطوبت غذا کا مرکب ہے اور کبھی یہی رطوبت دہن پتے پر بھی بہہ کر جاتی ہے اور اگر پتہ خشک ہو جاتا تو آدمی مر جاتا۔

پیٹ بند کیوں بنایا گیا؟

چند جاہل متکلمین اور کم عقل فلسفہ کے مدعیوں نے اپنی کم فہمی اور قصور علم سے یہ کہہ دیا کہ اگر آدمی کا پیٹ ایسا بنایا جاتا جیسے قبا ہوتی ہے کہ جب طبیب چاہتا کھولتا اور جو کچھ اس کے اندر ہے اسے دیکھ لیتا اور اپنا ہاتھ اس میں ڈال سکتا اور جب مرض کا علاج کرتا تو یہ اس سے بہتر ہوتا کہ بند رہے اور نگاہوں اور ہاتھ سے مخفی بنایا گیا ہے۔

اب جو اس کے اندر بیماری ہے اس کا حال باریک علامتوں سے معلوم ہوتا ہے مثلاً قارورہ دیکھنا، نبض پر ہاتھ رکھنا یا ایسی ہی اور باتیں۔ جن میں اکثر غلطی اور شبہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات یہ غلطی نبض وقارورہ شناسی میں موت کا باعث ہو جاتی۔

کاش یہ جاہل مدعیان فلسفہ وکلام یہ جانتے کہ اگر ایسا ہوتا تو آدمی کو موت اور بیماری کا ڈر ہی نہ رہتا۔ (جہاں کچھ بیماری ہوئی فوراً پیٹ کو کھول کر دیکھ لیا اور جو کچھ اس میں سبب مرض ہے اسے نکال کر دور کر دیا کیونکہ وہ قبا کے پردوں کی طرح تو بنا ہی ہوا ہے۔) اور

انسان کو اپنی بقا اور عدم موت کا خیال ہونے لگتا اور اپنی سلامتی پر مغرور ہو جاتا اور اس کی وجہ سے ان میں سرکشی اور نخوت پیدا ہوا جاتی۔

پھر یہ بھی ہوتا کہ پیٹ کے اندر کی رطوبت ٹپکتی رہتی اور بہا کرتی تو آدمی کی نشستگاہ اور خوابگاہ اور نفیس کپڑے اور زینت کے لباس سب خراب ہوتے رہتے۔ بلکہ اس صورت میں اس کا عیش تنگ ہو جاتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ معدہ اور جگر اور دل جو اپنا اپنا فعل کرتے ہیں۔ تو صرف اس حرارت غریزیہ کے سبب سے کرتے ہیں جسے اللہ تعالی نے پیٹ کے اندر پیدا کر رکھا ہے پس اگر پیٹ میں کھلنے کے در ہوتے جس سے نظر اور ہاتھ اس کے علاج کے لیے اندر جا سکتے تو ہوا کی برودت پیٹ کے اندر پہنچ جاتی اور حرارت غریزیہ سے مخلوط ہو جاتی تو باطنی اعضاء کا عمل بھی بگڑ جاتا پھر تو آدمی مر ہی جاتا۔

کیا نہیں دیکھتے ہو (اے مفضل) کہ اصل خلقت اور اصل ساخت کے علاوہ جو خیالات پیدا ہوتے ہیں محض غلط اور فاسد ہوتے ہیں۔

کھانے سونے اور جماع کے متعلق امور حکمۃ:

غور کرو اے مفضل! انسان کے کھانے، سونے اور جماع کے معاملے میں جو اس کے لیے مقرر کیے گئے ہیں اور جو ان میں حکمتیں صرف کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کے واسطے ایک محرک بنایا گیا ہے۔ جو اس کی خواہش کرے اور اسے ابھارے۔ پس بھوک کھانے کی مقتضی ہوتی ہے جس سے بدن اور قوامِ بدن کی حیوۃ و زندگی ہے اور نیند کی کیفیت سونے کی مقتضی ہوتی ہے جس سے بدن کو راحت ملتی ہے اور قوٰی کی تھکن دور ہوتی ہے اور اگر آدمی صرف اس وجہ سے کھانا کھایا کرتا، کہ اس کے بدن کو اس کی ضرورت ہے، اور خود اس کی طبیعت کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہوتی جو اسے کھانا کھانے پر مجبور کرتی تو ممکن تھا

کہ کسی وقت اس میں سستی بھی کرتا کاہلی یا ثقل کی وجہ سے۔ تو اس کا بدن لاغر ہو جاتا اور وہ مر جاتا جیسے کسی شخص کو کسی دوا کی صرف اس وجہ سے ضرورت ہوتی ہے کہ اس سے اپنے بدن کی اصلاح کرے مگر وہ اس کو ٹالتا رہتا ہے (کیونکہ طبیعت کی طرف سے کوئی قوی درخواست نہیں ہے۔) یہاں تک کہ یہ ٹالتے رہنا ہی بیماری اور موت کا سبب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر صرف اس سبب سے اور یہ سمجھ کر اسے اپنے بدن کو راحت دینے کی ضرورت ہے اور اپنے قوٰی کی تھکن مٹانی ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اس میں کاہلی کرتا اور اسے روکتا تو آخر اس کا بدن دبلا ہو جاتا۔

اور جماع صرف اس وجہ سے کرتا کہ اسے اولاد کی خواہش ہے (اور اس میں طبیعی شہوت اور جوش نہ ہوتا) تو بالکل بعید نہ تھا کہ وہ اس میں سستی کرتا۔ آخر نسل کم ہو جاتی یا بالکل جاتی رہتی۔ کیونکہ اکثر ایسے بھی آدمی ہیں جن کو اولاد کی خواہش نہیں ہے اور نہ اس کی پرواہ ہے۔ تو دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک فعل کے واسطے جس میں انسان کی تندرستی اور اصلاح ہے کس طرح اس کی طبیعت کے اندر ایک محرک پیدا کیا گیا جو اسے اس کی طرف آمادہ کرے اور اس کا محرک بنے۔

بدن کی چار قوتوں کی بیان:

اور جان لو کہ آدمی کے جسم میں چار قوتیں ہیں۔

(۱) **جاذبہ:** ہے جو غذا کو قبول کرتی ہے اور اسے معدہ میں لے جاتی ہے۔

(۲) **ممسکہ (ماسکہ):** ہے جو غذا کو روکتی ہے تا کہ طبیعت اس میں اپنا فعل کرے۔ (فعل انجام دے)

(۳) **ہاضمہ:** ہے یہ وہ قوت ہے جو اسے پکاتی ہے اور اس کا لب لباب نکال لیتی اور

بدن میں اس کو پھیلاتی ہے۔

(۴) **دافعہ:** ہے جو اسے دفع کرتی اور بچے ہوئے ثقل کو گراتی ہے جبکہ قوتِ ہاضمہ اپنی ضرورت پوری کر چکی ہے۔

لہذا غور کرو کہ ان چاروں قوتوں میں جو بدن کے اندر ہیں کیا اندازہ قائم کیا گیا ہے اور چونکہ ان کی ضرورت تھی تو کسی طرح بنائی گئیں اور ان میں کیا کیا حکمتیں اور تدابیر ہیں۔ (اگر ان چاروں قوتوں میں کسی ایک کی کمی ہوتی تو انتظامِ بدن میں خلل پڑ جاتا۔ آخر کو اسے موت آجاتی۔) اگر قوت جاذبہ نہ ہوتی تو آدمی اس غذا کی تلاش کے واسطے جس میں اس کے بدن کا قوام وقیام ہے کیونکر کوشش کرتا، اور اگر ماسکہ نہ ہوتی تو پیٹ کے اندر کیوں کر کھانا ٹھہر سکتا کہ معدہ اسے ہضم کرے، اور اگر ہاضمہ نہ ہوتی تو کیونکر پکتا، اور کیونکر وہ لب لباب نکلتا جو بدن کی غذا بن سکے اور اس میں خلل نہ پڑنے دے اور اگر دافعہ نہ ہوتی، تو وہ ثقل جسے ہاضمہ نے چھوڑ دیا ہے کیونکر دفع ہوتا اور یکے بعد دیگرے کس طرح نکلتا؟

کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح پروردگار سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنی لطیف کاریگری اور حسن تقدیر سے ان قویٰ کو بدن اور ان کاموں پر جن میں اس کی درستی ہے معین اور موکل کیا ہے۔ اس کی ایک مثال تم سے بیان کرتا ہے۔ وہ یہ کہ بدن کو تو سمجھو کہ ایک بادشاہ کا مکان ہے۔ اور اس کے حشم وخدم اور بچے اس مکان میں ہیں اور کچھ ملازمین ہیں جن کے حوالے اس کا انتظام ہے۔ ایک کا تو یہ کام ہے کہ وہ اس حشم وخدم کی ضرورتوں کو لا کر پہنچائے اور ان کے پاس رکھے اور دوسرے کا یہ کام ہے کہ جو کچھ آیا ہے اس کو لے اور جمع کرے، تاکہ اس کی اصلاح کی جائے اور قابل خوراک بنایا جائے۔ اور تیسرے کا یہ کام ہے کہ، اس کو درست کرے اور تیار کرے اور ہر ایک کو تقسیم کرے۔ چوتھے کا کام یہ ہے کہ کچھ گھر میں اس غلے وغیرہ کی وجہ سے کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا ہے اس کو مکان سے باہر پھینک دے۔

پس بادشاہ اس مکان کا تو خلاق حکیم ہے جو تمام عالم کا مالک ہے اور مکان، یہ بدن ہے اور حشم وخدم اعضاء ہیں اور نوکر چاکر یہی چاروں قوتیں ہیں۔

اے مفضل! شاید تم میرے اس بیان کو جو قوائے اربعہ اور ان کے افعال کی نسبت کیا، زائد اور بے کار خیال کرو، حالانکہ یہ میرا بیان اس نہج پر نہیں ہے جو اطباء کی کتابوں میں مذکور ہوا ہے اور نہ میری گفتگو اس معاملے مین ان کی گفتگو کی طرح ہے۔ کیونکہ ان لوگوں نے تو ان قوائے اربعہ کا ذکر اس بنیاد پر کیا ہے کہ فن طب اور بدنوں کے صحیح رکھنے میں اس کی ضرورت پڑتی ہے اور ہم نے اس رخ سے بیان کیا ہے کہ جس کی ضرورت دین کی اصلاح اور گمراہوں کے نفسوں کو کجی سے شفا دہی میں ہے۔ جیسے وہ میرا شافی بیان اور مثل جس میں نے تدبیر وحکمت کو واضح کر دیا ہے۔

حواس خمسہ کا بیان اور ان کی حکمتیں:

غور کرو اے مفضل! ان قویٰ کی بابت جو نفس انسان میں قرار دیے گئے ہیں اور وہ اس میں کس طرح واقع ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ فکر، وہم، عقل، اور حافظہ وغیرہ قویٰ میں غور کرو۔ دیکھو! کہ اگر ان میں سے صرف قوت حافظہ ہی آدمی میں نہ ہوتو اس کا کیا حال ہوگا اور کس قدر خلل اس کے کاموں میں اور امور معاش وتجارت میں پڑے گا جب کہ اسے یہی یاد نہ ہوگا کہ اس کا دوسروں پر کیا آتا ہے اور اس پر دوسروں کا کیا آتا ہے۔ کیا لیا تھا؟ کیا دیا تھا؟ کیا سنا تھا؟ کیا کہا تھا؟ اس سے کیا کہا گیا تھا؟ اور یہ بھی نہ یاد رہے گا، کہ کس نے اس پر احسان کیا تھا؟ اور کس نے برائی کی؟ کس چیز نے نفع پہنچایا تھا اور کس چیز نے نقصان؟

پھر اگر وہ کسی راہ پر بے شمار مرتبہ بھی چلتا تو بھی وہ راہ اسے یاد نہ رہتی۔ (کیونکہ اس کے دماغ میں قوت حافظہ ہی نہیں ہے) وہ اگر پڑھتا کسی علم کو تو تمام عمر یاد نہ کر سکتا، اور نہ کسی دین اور مذہب پر اپنا اعتقاد جما سکتا، نہ کسی تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا، اور نہ کسی گزشتہ

چیز پر کسی موجودہ چیز کو قیاس کر سکتا۔ (کیونکہ اسے یاد ہی نہیں کہ میں نے پہلے کیا دیکھا تھا۔) بلکہ وہ تو اس قابل ہوتا کہ انسانیت سے بالکل باہر سمجھا جائے۔

تو اے مفضل دیکھو! کہ یہ قوئی آدمی کے لیے کیسی بڑی نعمت ہیں؟ سب کو چھوڑ کر صرف ایک ہی کو دیکھو تو اس کا کیا حال اور کیا مرتبہ ہے (کہ اگر یہ ایک حافظہ آدمی میں نہ ہو تو سینکڑوں خرابیاں اس کے کام میں حائل ہوں اور آخر زندگی سے تنگ آ جائے۔)

نسیان کی حکمت:

حافظے سے بڑھ کر آدمی کو جو نعمت ملی ہے وہ تو نسیان (بھول) ہے۔ اگر نسیان نہ ہوتا تو آدمی کسی مصیبت میں تسلی ہی نہیں پا سکتا تھا اور نہ کبھی اس کی حسرت تمام ہو سکتی تھی، اور نہ کبھی اس کے دل سے کینہ نکل سکتا تھا۔ (یہی نسیان تو ہے کہ جب انسان کو عارض ہوتا ہے تو وہ اپنی مصیبت گزشتہ کو بھول جاتا ہے۔ کسی شے کی حسرت کو بھول جاتا ہے۔ کینہ کو بھول جاتا ہے اور میل جول پیدا کر لیتا ہے۔) اور نہ اشیائے دنیا میں سے کسی چیز سے فائدہ اور ذائقہ اٹھا سکتا جبکہ اس کو اپنی مصیبتیں یاد آتی رہتیں۔ نہ اس کو بادشاہ کی غفلت اور اپنے حاسد کے حسد سے ست پڑ جانے کی امید رہتی (اسے ہر وقت خیال رہتا کہ میں نے بادشاہ کا فلاں گناہ کیا ہے اسے یاد تو ضرور ہی ہوگا۔ اب وہ مؤاخذہ کرے گا۔ اور اس خیال میں اس کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ علیٰ ہذا القیاس، حاسد کے حسد کے خیال سے جو اس کو تکلیف پہنچتی رہتی وہ بھی اس کو تلخ عیش کرتی رہتی۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ آدمی میں یہ دونوں قوتیں حافظہ اور نسیان کیسی متضاد پیدا کی گئی ہیں اور ہر ایک کیلئے ایک خاص مصلحت قرار دی گئی ہے (کیا کسی حکیم کے فعل کے بغیر ایسی حکمتیں ظہور میں آ سکتی ہیں اور جو لوگ کہ تمام اشیائے عالم ے دو متضاد خالق مانتے ہیں (جیسے مانویہ) بالکل امید نہیں کہ وہ ان دو متضاد چیزوں کا خالق بھی انہیں دو متضاد خالق کو

مانیں۔ کیونکہ ان دونوں متضاد قوتوں میں وہ مصلحتیں ہیں جنہیں تم دیکھ رہے ہو (حالانکہ ان کے نزدیک شر کے خالق سے سوائے شرارت اور بدی کے کچھ پیدا نہیں ہو سکتا اور یہاں دونوں متضاد قوتوں میں نفع ہی نفع ہے۔ تو کیونکر شر والا خالق ان میں سے کسی ایک کو پیدا کر سکتا۔)

مفضل! غور کرو اس صفت پر خاص آدمی ہی کو دی گئی ہے، اور اس کے ساتھ کوئی اور ان تمام مخلوق حیوانات میں سے اس کا شریک نہیں ہے وہ کیا ہے؟ وہ شرم ہے، اگر یہ نہ ہوتی تو کبھی کوئی شخص مہمان کی مہمانداری نہ کرتا، کوئی شخص اپنا وعدہ نہ پورا کرتا، اور نہ کسی کی ضرورت پوری ہوتی اور نہ نیکی حاصل کی جاتی، اور نہ بدی سے پرہیز کیا جاتا، یہاں تک کہ ایسے بہت سے امور واجبہ ہیں جو صرف حیا وشرم کی وجہ سے بجالائے جاتے ہیں۔ کیونکہ جس نے حیا چھوڑ دی، وہ نہ تو والدین کے حق کی رعایت کرتا ہے، نہ قرابت داروں سے صلہ رحمی کرتا ہے، نہ امانت ادا کرتا ہے اور نہ کسی فحش بات سے اجتناب کرتا ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ کیونکر آدمی میں یہ تمام باتیں پورے طور پر جمع کر دی گئیں جن میں اس کی بھلائی اور اس کے کام کا پورا ہونا ہے۔

گویائی کی طاقت اور اس کی حکمتیں:

مفضل! غور کرو اس نعمت نطق (گویائی) پر جو اللہ تعالیٰ تقدست اسمائہ نے اسے دی ہے جس سے یہ اپنے باطنی خیال اور دلی بات کو ظاہر کرتا ہے اور جسے اس کی فکر پیدا کرتی ہے اور اسی سے دوسروں کی دلی بات کو بھی سمجھتا ہے۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو یہ مثل چوپاؤں کے ہوتا جو نہ اپنے دل کی بات بیان کر سکتے ہیں اور نہ بیان کرنے والے کی بات کو سمجھ سکتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس، تحریر کی صفت ہے جس سے گزشتہ لوگوں کے حالات موجودہ

لوگوں کے لیے اور موجودہ لوگوں کے حالات آئندہ والوں کے لیے قیدِ قلم میں لائے جاتے ہیں اور اسی کے ذریعے سے علوم و آداب وغیرہ کی کتابیں ہمیشہ باقی رہتی ہیں اور اسی کے ذریعے سے ان گفتگوؤں اور حساب وغیرہ کو یاد رکھتا ہے جو اس کے اور کسی غیر کے درمیان واقع ہوتے ہیں۔ اگر یہ صفت نہ ہوتی تو ایک زمانے کی چیزیں دوسرے زمانے سے بالکل منقطع ہو جاتیں اور نیز ان لوگوں کی خبریں بھی نہ ملتیں جو اپنے وطنوں سے جدا ہیں اور علوم بھی معدوم ہو جاتے۔ آداب و اخلاق کی باتیں بھی تلف ہو جاتیں اور بہت ہی بڑا اخلل لوگوں کے کاموں اور معاملات میں واقعہ ہوتا جنہیں دیکھنے کی انہیں ضرورت ہے اور جن کو نہ جاننا ان کو ممکن ہی نہیں (بلکہ لازم ہے کہ انہیں دیکھیں)

شاید تم یہ خیال کرو کہ انسان نے اس ضرورت کو اپنی تدبیر اور فہم و زکاوت سے حاصل کیا ہے؟ انسان کی طبیعت و فطرت میں یہ قوت پیدا نہیں کی گئی ہے، علیٰ ہذا القیاس گفتگو اور کلام ہے۔ کیونکہ یہ بھی اصطلاحی اور قرار داد چیز ہے جسے لوگ آپس میں ٹھہرا لیتے ہیں اور اسی کے مطابق آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف فرقوں میں مختلف زبانیں ہیں، اور اسی طرح تحریریں، جسے عربی تحریر اور سریانی اور عبرانی اور رومی وغیرہ جو ان تمام فرقوں میں مختلف ہے۔ اس کی ایک اصطلاح قرار دے لی ہے۔ جیسے کلام اور الفاظ کی اصطلاح۔

پس جو شخص اس کا دعویٰ کرے (کہ اس میں خدا نے کیا کیا ہے یہ تو آدمی نے خود بنالی ہے۔) تو اس کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اگرچہ ان دونوں امور میں انسان کی تدبیر اور فعل کو دخل ہے لیکن جس چیز کے سبب سے وہ اس تدبیر اور اس فعل تک پہنچا وہ بے شک ایک عطیہ ہے اور خدائے تعالیٰ عز و جل کی بخشش ہے جو اس کی ساخت کے اندر قرار دی ہے (مثلاً عقل یا زبان، جس کے ذریعے سے ان اصطلاحات کے قائم کرنے کی اسے قدرت

حاصل ہوئی ہے۔) پس اگر اس کو زبان نہ دی گئی ہوتی جس سے وہ گفتگو کرے اور ذہن نہ ملا ہوتا جس سے وہ کاموں کی راہ پا سکے تو وہ ہرگز بول نہ سکتا اور اگر اس کو ہتھیلی اور انگلیاں نہ دی گئی ہوتیں تو لکھنا کبھی اس سے ممکن نہ ہوتا۔

اس بات کی عبرت بہائم سے حاصل کرو جن کو نہ کلام کی طاقت ہے نہ تحریر کی۔ (کیونکہ ان میں نہ وہ ذہن ہے اور نہ وہ آلات تحریر و کتابت ہیں۔) پس (معلوم ہوا) دراصل یہ باری تعالیٰ و تقدس کا (قانون) فطرت ہے جس پر اسے پیدا کیا ہے، اور خلق پر اس کا ایک تفضل ہے۔ جو کوئی اس کا شکریہ ادا کرے گا اسے ثواب ملے گا اور جو اس نعمت کا کفران کرے گا تو کچھ پروا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہان سے مستغنی ہے۔ (اسے کسی کے شکر کی ضرورت نہیں)

انسان کا علم:

مفضل! غور کرو ان چیزوں میں جن کا علم آدمی کو دیا گیا ہے اور جس کا علم نہیں دیا گیا۔ ان تمام چیزوں کا اسے علم دیا گیا، جن میں اس کے دین اور دنیا کی بھلائی ہے۔ خالق تبارک و تعالیٰ کی معرفت ہے جو دلیلوں اور ان شہادتوں کے ذریعے سے حاصل کی جائے جو اس کی مخلوقات کے اندر موجود ہیں۔ اور ان امور کی معرفت ہے جو اس پر واجب ہیں۔ مثلاً تمام آدمیوں کے ساتھ انصاف کرنا۔ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، امانت کا ادا کرنا، محتاجوں کی غم خواری کرنا، وغیرہ وغیرہ جن کی معرفت اور جن کا اقرار فطرتاً اور قدرتاً تمام امتوں میں ہے۔ خواہ وہ ہمارے موافق ہوں یا مخالف۔ علیٰ ہذا القیاس اسے ان چیزوں کا علم دیا گیا ہے جن میں اس کی دنیا کی بھلائی ہے۔ جیسے زراعت، باغبانی، زمینوں کا آباد کرنا، بھیڑوں اور چوپاؤں کا جمع کرنا، پانی کا کوؤں یا چشموں وغیرہ سے نکالنا، جڑی بوٹیوں کی شناخت جن سے بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے

معدن کی پہچان، جن سے قسم قسم کے جواہر نکالے جاتے ہیں، کشتی پر سوار ہونے، دریا میں غوطہ خوری اور وحوش و طیور اور مچھلیوں کے شکار کرنے کی انواع و اقسام کی تدبیریں اور تجارت، کسب معاش کے طریقوں کی معرفت اور ان کے علاوہ بہت سی اور چیزیں ہیں جن کے بیان میں طول ہے اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں انسان کی دنیاوی زندگی کے کاموں کی درستی ہے۔ تو ان چیزوں کا علم دیا گیا ہے جس میں اس کی دینی اور دنیاوی بہتری ہو علاوہ اس کے اور جو باتیں ہیں جن کا جاننا اس کی طاقت سے باہر ہے اور نہ اس کی حالت اس کی مقتضی ہے ان کا علم اسے نہیں دیا گیا۔ مثلاً علم غیب اور جو بات آئندہ ہونے والی ہے یا بعض وہ چیزیں جو پہلے ہو چکی ہیں۔ جیسے آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے کی چیزوں کا جاننا اور جو دریاؤں کے اندر ہے اور عالم کے چاروں طرف ہے یا جو کچھ لوگوں کے دلوں میں ہے یا جو رحم کے اندر ہے وغیرہ ذلک ان کا علم آدمیوں کو نہیں دیا گیا ہے اور جن لوگوں نے ان کے جاننے کا دعوٰی کیا، ان کے دعوؤں کو ان باتوں نے باطل کرو یا جو برخلاف ان کے بیان کے ظاہر ہوئیں (اور جس کے جاننے کا انہوں نے دعوٰی کیا تھا اس کے مخالف نمایاں ہوئیں۔)

لہذا دیکھ، اے مفضل! کہ انسان کو کس طرح تمام ان چیزوں کا علم عطا ہوا جو اس کے لیے اس کے دنیاوی اور دینی امور میں ضروری ہیں اور اس کے ناروا چیزوں کے جاننے سے روک دیا گیا تاکہ اس کی قدر اور اس کا نقصان معلوم ہو جائے (یعنی تاکہ معلوم ہو جائے کہ آدمی دراصل ایک بے حقیقت چیز ہے اس مین بہت کچھ نقصان اور کمی ہے۔ جس سے اس کو غرور و نخوت نہ پیدا ہونے پائے۔) اور ان دونوں باتوں میں اس کی بہتری ہے (اگر ان امور غیبیہ وغیرہ کا بھی اس کو علم دیا جاتا تو انسان کا غرور حد سے زیادہ ہو جاتا، جب کہ تھوڑے سے علم پر آدمی پھولا نہیں سماتا تو جب کہ تمام معلومات غائب و حاضر اس کے پیش نظر ہو

جاتے تو اپنے تئیں خدا ہی کہنے لگتا۔) لہذا ان چیزوں کی معرفت سے محروم رکھا گیا تاکہ جانے کہ میں ایک انسان ناقص ہوں مجھ سے بھی کوئی بڑھ کر موجود ہے۔ جسے ان کا بھی علم ہے اور وہ باری تعالیٰ عزاسمہٗ ہے۔

اب اے مفضل! ذرا غور کرو کہ انسان کو اس کی مدت حیات کا علم کیوں نہیں دیا گیا، وہ اس وجہ سے کہ اگر آدمی اپنی زندگی کو جان لیتا اور بالفرض اس کی زندگی بھی تھوڑی ہوتی تو زندگی نہایت تلخ ہو جاتی، کیونکہ اب وہ اس جان لینے اور علم کی وجہ سے موت کا منتظر اور اس وقت کا متوقع رہتا، بلکہ وہ اس شخص کے مانند ہو جاتا کہ جس کا تمام مال برباد ہو گیا ہو یا قریب بربادی کے ہو اور وہ اپنی مفلسی اور فقیری کو محسوس کر رہا ہو تو اس کو اپنے مال کے فنا ہونے اور اپنے فقر کا کیسا ڈر ہوگا، بلکہ وہ غم و اندوہ جو اسے اپنی زندگی کے فنا ہونے کی طرف سے پیدا ہوگا وہ اس خوف سے کہیں زیادہ ہوگا جو اسے اپنے مال کے خیال میں ہوگا۔ کیونکہ جس شخص کا مال تلف ہو جائے اسے تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اس کے عوض اور مل جائے گا اور اس سے اس کے دل کو تسکین ہو جائے گی بخلاف اس کے کہ جسے اپنی زندگی کے فنا ہونے کا یقین ہو جائے تو اس کی ناامیدی قوی ہو جائے گی اور اگر اس کی عمر زیادہ ہوتی اور اسے معلوم ہو جاتا کہ میں زیادہ مدت تک زندہ رہوں گا تو اسے اپنی بقا پر بھروسہ ہو جاتا اور دنیاوی لذتوں اور جملہ معصیتوں میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا اور اس خیال سے گناہ کرتا کہ آج تو اپنی شہوت پوری کر لوں، پھر آخر میں توبہ کر لوں گا۔ حالانکہ یہ وہ بات ہے جسے پروردگار عالم اپنے بندوں سے نہیں چاہتا، اور نہ اسے پسند کرتا ہے۔ (بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ بندہ ہمہ وقت میری ہی طرف متوجہ رہے ملاہی و بدعت میں بالکل نہ مصروف ہو۔)

دیکھو! اگر تمہارا کوئی غلام کسی کام کو اس خیال سے کرے کہ سال بھر تو تم کو ناراض رکھے اور ایک دن یا ایک مہینہ تم کو راضی رکھے تو ہرگز تم اس کی یہ بات پسند نہ کرو گے۔ اور

تمہارا یہ غلام نیک اور صالح غلام کے رتبے پر (تمہارے نزدیک) نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر وہ ہر وقت اور ہر حالت میں تمہاری اطاعت اور خلوص ہی دل میں رکھے (تو وہ ضرور تمہیں بہت زیادہ محبوب ہوگا۔)

اس پر اگر تم یہ اعتراض کرو کہ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ ایک مدت تک آدمی نافرمانی کرتا رہے۔ پھر جب توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے؟ تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے کہ یہ اسی صورت میں ہوتا ہے کہ جب انسان کی خواہش نفسانی غالب نہ آ جائے اور اس کی مخالفت کر سکے اور دل میں یہ نہ ٹھان لے (کہ ہم مخالفت ہی کیے جائیں گے) اور اسی پر موقوف نہ رکھے (کہ آج چین کر لیں، کل توبہ کر لیں گے) تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر کرتا ہے اور اپنے تفضّل سے اس کو معاف کرتا ہے۔ لیکن جو کوئی یہ ٹھان لے کہ جب تک اس کے دل میں ہے ایسے شخص کو جو اس کے دھوکے میں نہیں آ سکتا، کہ اس وقت تو نقداً نقد لذت اٹھا لے اور اپنے تئیں آئندہ توبہ کا امیدوار اور موعود بنائے اور نیز اس وجہ سے بھی اپنے وعدے کو پورا نہ کر سکے گا۔ کیونکہ ناز پروری اور تلذذ سے باز آنا اور توبہ کی زحمت اٹھانا خصوصاً بڑھاپے اور بدن کی کمزوری کے زمانے میں نہایت دشوار امر ہے۔ اور جو شخص توبہ میں حیلہ حوالہ کرتا ہے اس پر اس امر کا بھی امن نہیں ہے کہ دفعتاً موت اسے ہلاک کر دے اور وہ بغیر توبہ کیے دنیا سے چلا جائے مثلاً کسی شخص پر قرض ہو اور وہ اس کے ادا کر دینے پر قادر بھی ہو باوجود اس کے ادائے قرض میں حیلہ حوالہ کرتا رہے یہاں تک کہ موت آئے اور مال بھی فنا ہو جائے تو وہ قرض اس کے اوپر قائم رہ جائے گا۔

لہذا، انسان کے لیے بہتری اسی میں تھی کہ اس کی مقدار عمر کا علم اس سے مخفی رکھا جائے تا کہ وہ اپنی تمام عمر موت کا منتظر رہے اور اس ڈر سے گناہوں کو ترک کرے اور نیک عمل اختیار کرے۔

اب اگر تم یہ اعتراض کرو کہ اس وقت بھی جب کہ اس کی مدت عمر کا حال اسے نہیں معلوم اور وہ ہر وقت موت کا ترقب رکھتا ہے، بدکاریوں کا مرتکب ہوتا ہے اور حرام کام کر لیتا ہے، تو ہم اس کا یہ جواب دیں گے۔ کہ،

''اس معاملے میں تدبیر تو ایسی ہی کی گئی ہے جس پر یہ کام جاری ہے اب اگر باوجود اس کے کوئی شخص نہ باز آئے اور برائیوں سے نہ پرہیز کرے تو یہ اس کی بداعتدالی مزاج اور قساوت قلبی ہے۔ اس میں اصل تدبیر کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ جیسا کہ طبیب ان چیزوں کو مریض سے بیان کر دیتا ہے جن سے اسے نفع پہنچے، پھر بھی اگر مریض اس کی بات نہ مانے، اس کے مشورے پر نہ چلے اس کے منع کیے ہوئے امور سے باز نہ رہے، تو کبھی طبیب کی بتائی ہوئی باتوں سے فائدہ اٹھا سکے گا اور اس میں طبیب کی کوئی برائی نہیں ہے بلکہ اسی بیمار کی برائی ہے۔ کیونکہ اس نے طبیب کا کہنا نہ مانا۔

اور اگر چہ انسان باوجود امید موت کے جو اسے عدم علم زمانہ موت کی حالت میں ہر وقت حاصل ہے گناہوں سے باز نہیں رہتا، لیکن اگر اسے اپنی بقا و طول حیات پر پورا بھروسہ ہو جائے تو پھر وہ نہایت ہی بد اور ناگوار گناہان کبیرہ کرنے لگے گا اور موت کا انتظار اور خیال اس کے لیے ہر حال میں بہ نسبت اپنی طول حیات و بقا پر بھروسہ کرنے کے بہتر ہے۔ (کہ اس سے کچھ تو اس کے دل میں ڈر رہے گا، کچھ تو خدا کا خیال کرے گا جس سے وہ گناہان سخت سے بچ سکے گا) اور اگر ایسا ہے کہ ایک قسم کے آدمی باوجود ترقب موت کے اس سے غافل ہیں اور اس سے نصیحت نہیں حاصل کرتے تو دوسرا گروہ ایسا بھی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور معصیت سے باز رہتا ہے اور عمل صالح بجالاتا ہے اور محتاجوں اور فقیروں کو صدقہ دینے کے لیے اپنے مال اور نفیس اشیاء میں بخشش سے کام لیتا ہے، تو ہرگز انصاف نہیں تھا کہ یہ لوگ اس بات سے فائدہ اٹھانے سے محروم لیے جاتے (اور وہ لوگ

اس میں سے حصہ نہ لیتے۔) (یعنی ایک لے نہ فائدہ اٹھانے سے دوسرا اس فائدے سے کیوں محروم کیا جاتا، لہذا حال موت مخفی کیا گیا، کہ جس شخص سے بھی ہو سکے اس سے فائدہ اٹھالے اور جو فائدہ نہ اٹھائے وہ اس کی بدنصیبی۔)

مفضل! غور کرو، خوابوں میں (رات کے وقت آدمی جو خواب دیکھتا ہے) اس میں کیا حکمت و مصلحت صرف کی گئی ہے۔ اور سچے خواب کو جھوٹے میں مخلوط کر دیا ہے۔ پس اگر سب کے سب خواب سچے ہوتے تو تمام آدمی انبیاء ہی ہو جاتے۔ (پھر وہ حکمت جو اصل خلقت انسان میں ہے فوت ہو جاتی۔ یعنی معاملہ امتحان۔) اگر تمام خواب جھوٹے ہی ہوتے تو اس میں کچھ فائدہ نہ تھا بلکہ زائد بیکار اور بے معنی ہوتے۔

لہذا، کبھی تو خواب سچے ہوتے ہیں تا کہ آدمی اس سے اپنی اس مصلحت و کاروبار میں فائدہ اٹھائے جس کی اسے ہدایت ملی ہے یا جس نقصان کا اسے حال معلوم ہوا ہے۔ اس سے بچاؤ کرے اور اکثر جھوٹے ہوتے ہیں تا کہ آدمی انہیں پر پورا بھروسہ نہ کرلے۔ (کہ جو ہم خواب دیکھیں گے اسی کے مطابق عمل کریں گے اگر ایسا ہوتا تو پھر خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے اور بھلائی برائی میں اس سے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہ معلوم ہوتی۔)

غور کرو، اے مفضل! ان چیزوں میں جنہیں تم عالم میں موجود دیکھ رہے ہو اور جو اس لیے مہیا کی گئی ہیں کہ آدمیوں کو ان کی ضرورت ہے۔

مٹی تو مکان بنانے کے لیے اور لوہا، دستکاری کے لیے۔ لکڑی، کشتی وغیرہ بنانے کے واسطے، پتھر، چکیاں وغیرہ بنانے کے واسطے، تانبا، برتنوں کے واسطے، سونا، چاندی، معاملات کے لیے (لین دین کے لیے۔) جواہرات، ذخیرہ کرنے کے واسطے۔ دانے، غذا کے واسطے، پھل، تفکہ کے واسطے، گوشت، کھانے کے لیے۔ خوشبودار چیزیں، لذت حاصل

کرنے کے واسطے، دوائیں، بیماروں کو صحیح وتندرست کرنے کے لیے۔ چوپائے، بار برداری کی غرض سے، سوکھی لکڑیاں، آگ جلانے کے واسطے، راکھ، چونا بنانے کے لیے، ریت، زمین کے فائدے کے لیے اور کوئی کس قدر ایسی چیزوں کو شمار کرے۔ (یعنی، ایسی ہی بے شمار چیزیں ہیں جن کا حصر نہیں ہوسکتا۔)

تو کیا اے مفضل! تمہارا یہ خیال ہے اگر کوئی شخص کسی مکان میں داخل ہو اور دیکھے کہ اس میں انسان کی تمام ضرورت کی چیزیں مہیا وموجود ہیں تمام مکان ہی اس خزانے سے بھرا پڑا ہے، اور دیکھے کہ ہر ایک چیز ایک خاص سبب سے رکھی ہوئی ہے۔ تو کیا وہ یہ خیال کرے گا کہ اس کا رکھنے والا کوئی نہیں خود بخود رکھی گئی ہیں۔ کیونکہ کوئی عقلمند آدمی اس بات کو تجویز کرسکتا ہے کہ یہ عالم اور جو کچھ اس کے اندر ہے خود بخود ہو گیا ہے (اور کوئی ان کا خالق نہیں ہے)

اے مفضل! ان چیزوں سے عبرت حاصل کرو جو انسان کی ضرورتوں کے لیے بنائی گئی ہیں اور ان میں کیا حکمت ہے؟

تو دیکھو! اس خوراک کے واسطے دانہ پیدا کیا گیا اور اسے اس کے پیسنے، گوندھنے اور روٹی پکانے کی تکلیف دی گئی، اون اس کے لیے پیدا کیا گیا اور اسے اس کے ڈھنکنے، اس کو کاتنے اور اسے بننے کی تکلیف دی گئی۔ درخت اس کے لیے پیدا کیا گیا، اور اس کا بونا، اس کا سینچنا، اس کی نگہداشت اس کے متعلق کی گئی، جڑی بوٹیاں اس کی دوا کے لیے بنائی گئیں اور اس کے حاصل کرنے اس کو باہم ملانے، اس کو بنانے کی تکلیف اسے دی گئی اور علیٰ ہذا القیاس تم تمام چیزوں کی اسی طرح پاؤ گے۔ تو دیکھو کہ ان کے بنانے والے نے کیونکر ان چیزوں کو بنا کر انسان کی مدد کی جن میں بالکل اس کی تدبیر کارگر نہ [1] ہوسکتی تھی اور

(۱) ظاہر ہے کہ اگر یہ خبریں نہ ہوتیں تو انسان خود پیدا نہیں کرسکتا تھا، پھر ضرورت کے وقت کہاں لاتا۔ لہذا مدبر عالم نے ان چیزوں کو پہلے سے ہی پیدا کر دیا۔

ان میں عمل وتصرف کرنے کی ضرورت اور محل کو اسی پر چھوڑا کیونکہ اس کی بہتری اسی میں تھی، اس لیے کہ اگر وہ (خدائے تعالیٰ) ان کاموں کو بھی کر دیتا (جو انسان کے متعلق ہیں۔ مثلاً اناج کا پیسنا، اس کا صاف کرنا اسے گوندھنا اور پھر روٹی پکانا۔) اور اس کے لیے ان چیزوں میں تصرف وعمل کی ضرورت ہی نہ رہتی، تو وہ فخر اور نخوت سے زمین پر پنجوں کے بل چلنے لگتا اور زمین اسے اٹھا نہ سکتی (حد کی نخوت اس کے مزاج میں پیدا ہو جاتی) اور یہ بات اسے اس حد تک پہنچا دیتی کہ وہ ایسے کام کرنے لگتا جس میں اس کی تباہی اور ہلاکت ہوتی۔

نیز اگر انسان کی تمام ضروریات بے عمل دست موجود کر دیتا تو ان کی زندگی کچھ خوش مزہ نہ ہوتی اور نہ اس چیز کی کچھ لذت ان کو ملتی (کیونکہ وہ بغیر مشقت حاصل ہوئی ہے اور جو چیز بغیر مشقت ملتی ہے اس کے ملنے کی نہ انسان کو کچھ قدر ہوتی ہے اور نہ اس سے اس کی روح کو کچھ فرحت حاصل ہوتی، ہاں اگر مشقت اور محنت کے بعد حاصل ہو تو اس کے ملنے سے دل کو کیفیت آتی ہے اور وہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ جب کہ اپنی کوشش کا نتیجہ سامنے دیکھ لیتا ہے۔)

کیا تم، اے مفضل! نہیں دیکھتے کہ جو شخص کہیں مہمان کے طور پر جاتا ہے اور وہاں ایک زمانے تک قیام کرتا ہے، اور اس کی تمام ضروریات میزبان کی طرف سے برابر ملتی رہتی ہیں نہ اسے کھانے کی چیزیں مہیا کرنی پڑتی ہیں نہ پینے کی نہ سونے بیٹھنے کی۔ بالآخر وہ اس بے کار رہنے اور معطل بیٹھنے سے اکتا جاتا ہے اور اپنے لیے کوئی مشغلہ تلاش کرنے لگتا ہے۔ تو کیا حال ہوتا جب کہ تمام عمر اسے کوئی کام ہی نہ کرنا پڑتا۔ (روٹی پکی پکائی مل جاتی، کپڑے سلے سلائے آ جاتے، درخت بغیر باغبانی کیے ہوئے پھل اپنے دے دیتے اور اس کے منہ تک پہنچا دیتے۔) تو انسان کے لیے یہی مصلحت ٹھہری کہ اس کے لیے ان کاموں میں ہاتھ لگانے کی ضرورت باقی رکھی گئی۔ تا کہ معطل اور بے کار بیٹھنا اس کو خاطر

برداشتہ نہ کر دے اور ان کاموں کے کرنے سے روکے جنہیں وہ حاصل نہیں کر سکتا اور اگر حاصل بھی کر لے تو اس میں اس کے لیے کوئی بھلائی نہ ہو مثلاً بعض آدمی جن کے پاس دولت ہوتی ہے اور وہ بے کار رہتے ہیں تو ان کو یہ دھن سماتی ہے کہ کیمیا بنانی چاہیئے۔ اس فکر میں ہزاروں روپیہ برباد کرتے ہیں، گھر کا اثاثہ ضائع کرتے ہیں مگر نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کیوں ہوا؟ اسی وجہ سے تو، کہ وہ بے کار بیٹھے تھے۔ طبیعت تو چاہتی ہے کہ کوئی شغل اس کے لیے ہونا چاہیے۔ لہذا ادھر متوجہ ہوئی اور جب ادھر متوجہ ہوئی تو مال و زر ضائع ہوا اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا، اور اگر کسی کو لاکھ دو لاکھ میں کچھ معلوم بھی ہو گیا تو اس کو فائدے مند نہیں ہوتا۔ تجربہ اس پر شاہد ہے۔

پس حکیم علی الاطلاق اور مدبر عالم نے اپنی قدرت سے اس کے لیے پہلے ہی سے مشغلے پیدا کر دیے ہیں۔ جن میں مصروف رہے اور فضول کاموں میں ہاتھ نہ ڈالے جن سے اس کو نقصان پہنچے۔)

جان لو، اے مفضل! کہ انسان کی اصل معاش و زندگی روٹی اور پانی ہے۔ تو دیکھو! کہ ان میں کیا کیا تدبیریں صرف کی گئی ہیں۔

آدمی کو پانی کی ضرورت روٹی کی ضرورت سے زیادہ ہے اور یہ اس سبب سے ہے کہ انسان بھوک پر بہ نسبت پیاس کے زیادہ صبر کر سکتا ہے اور جس قدر روٹی کا محتاج ہے اس سے زیادہ پانی کا محتاج ہے۔ کیونکہ اسے پانی کی ضرورت پینے کے لیے پڑتی ہے، وضو میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، کپڑا دھونے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، چوپاؤں کو پلانے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے، زراعت کے سینچنے میں یہ درکار ہے لہذا پانی تو ایسا عام بنایا گیا ہے جس کے خریدنے کی ضرورت نہ ہو، تا کہ انسان کو اس کی تلاش میں مشقت نہ اٹھانی پڑے، اور روٹی ایسی بنائی گئی کہ اس کی تحصیل دشوار ہو اور بغیر تدبیر کے ہاتھ نہ آ سکے،

تا کہ انسان کا یہ شغل برقرار رہے اور اسے تکبر و نخوت کا موقع نہ دے اور فضول کاموں سے روکے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک بچہ جب کہ وہ بالکل صغیر السن ہوتا ہے معلم کے پاس تعلیم کے لیے بھیج دیا جاتا ہے، صرف اس لیے کہ کھیل کود میں مصروف نہ ہونے پائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو یا اس کے عزیزوں کو اس سے کوئی تکلیف اٹھانی پڑے۔ علی ہذا القیاس اگر انسان بالکل شغل سے خالی ہوتا تو ناز و تبختر اور فضول کاری اور نخوت سے ایسے کام کر گزرتا جن کا نقصان اسے بہت سخت پہنچتا۔

اس کو یوں سمجھو کہ مثلاً جو شخص بالکل آرام و آسائش اور اپنے اقربا کی تو انگری اور خوش عیشی اور ناز و نعم وغیرہ میں پلا ہو وہ ان امور میں پڑ جاتا ہے۔

ایک آدمی دوسرے آدمی سے کیوں مشابہہ نہیں ہوتا؟

سمجھو! کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے کیوں مشابہہ نہیں ہوتا، جیسا کہ وحوش و طیور وغیرہ صورت میں ایک سے ہوتے ہیں۔ تم ہرنوں اور چکوروں کا ایک گلہ اور جھنڈ دیکھتے ہو جس میں کا ہر ایک دوسرے سے مشابہہ معلوم ہوتا ہوگا اور کوئی فرق ان میں باہم محسوس نہیں ہوتا ہوگا اور آدمیوں کو دیکھتے ہو کہ سب کی صورتیں اور ساخت جدا جدا ہیں۔ یہاں تک کہ دو آدمی ایک صفت کے کم ہی دکھائی دیں گے۔

سبب اس میں یہ ہے کہ ان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر ایک اپنی صورتوں اور حلیوں سے پہچانا جائے۔ کیونکہ ان میں باہم معاملات ہوتے رہتے ہیں اور یہ معاملات بہائم وغیرہ میں نہیں ہوتے، تا کہ ایک کو دوسرے کے شخصی طور پر پہچاننے کی ضرورت ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ وحوش وطیور کا باہم متشابہہ ہونا انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچاتا، مگر انسان ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اتفاقاً اگر کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ باہم پیدا ہونے والے دو بچے ایک دوسرے سے مشابہہ ہوں تو لوگوں کو ان سے معاملات میں سخت مشکل اور دشواری پیش آتی

ہے اور جو ایک کو دینا چاہیے وہ دھوکے سے دوسرے کو دیا جاتا ہے، اور ایک کے بدلے میں دوسرے کو پکڑا جاتا ہے۔ (مثلاً عطار کو دوا میں بیخ بادیان دینی ہے اور دھوکے میں وہ بیخ کنیر دے دیتا ہے یا بخار کی گولی دینی ہے اور وہ بہ سبب مشابہت کے جمال گھوٹے کی گولیاں دے دیتا ہے جس سے مریض کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔) چہ جائیکہ صورت کا تشابہہ (یہ تو اور بھی نقصان رساں ثابت ہوتا۔) تو کس نے اپنے بندوں کے لیے ایسی باریکیاں اور لطائف پیدا کیے جن کا خطور بھی دل میں ہونا دشوار ہے کہ اس کی خوبی پر مطلع ہو۔ ہاں یہ اسی نے پیدا کیے جس کی رحمت ہر چیز پر پھیلی ہوئی ہے۔ (فتبارک اللہ احسن الخالقین۔) کیا طبیعت اور نیچر میں بھی یہ طاقت ہے کہ ایسے ایسے لطائف کو سمجھے اور پھر اسے مناسب موقعوں اور ضرورتوں کے ساتھ حسب حال پیدا کر سکے۔ توبہ کرو۔ (لا حول و لا قوۃ الا باللہ)

اے مفضل! اگر تم کسی آدمی کی تصویر دیوار پر کھینچی ہوئی دیکھو اور کوئی تم سے کہے کہ یہ تصویر خود بخود ظاہر ہوئی ہے کسی بنانے والے نے اسے نہیں بنایا ہے، تو کیا تم اس بات کو مان لو گے؟ نہیں، بلکہ تم اس کی بات پر ہنسو گے۔ تو کیونکر تم ایک بے حس تصویر کی بابت اسے نہیں مانتے کہ وہ بغیر بنائے ہوئے بن گئی اور ایک انسان جیتے جاگتے، بولتے چالتے ہوئے کی نسبت ماننے کے لیے تیار ہو کہ وہ خود بخود پیدا ہو گیا۔

جانداروں کے جسم مخصوص حد تک کیوں بڑھتے ہیں؟

ایسا کیوں ہے کہ جانداروں کے جسم باوجود یہ کہ ہمیشہ غذا کھاتے رہتے ہیں برابر بڑھتے ہی نہیں رہتے بلکہ نمو کی ایک حد تک پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں، اور اس سے آگے نہیں بڑھتے، اگر اس میں کوئی حکمت نہیں تو ایسا کیوں ہے؟

اس میں حکیم مطلق کی تدبیر یہ ہے کہ حیوانات کی ہر صنف کے جسموں کی مقدار

ایک حد معین پر رہے۔ نہ اس سے بڑی ہو نہ چھوٹی اور وہ بڑھتے رہتے ہیں جب اس حد معین پر پہنچتے ہیں، ٹھہر جاتے ہیں۔ حالانکہ غذا برابر جاری رہتی ہے منقطع نہیں ہوتی۔ اگر برابر بڑھتے ہی رہتے تو وہ اجسام نہایت بڑھ جاتے اور ان کی مقداریں مشتبہ ہو جائیں اور کسی کی کوئی حد معروف و معلوم نہ رہتی۔

انسان کو تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے؟

خاص کر آدمیوں کے بدن میں ایسا کیوں ہے کہ حرکت اور مشی سے ان میں گرانی پیدا ہو جاتی ہے اور باریک صنعتوں سے بھاگتے ہیں؟

اسی وجہ سے نا، کہ جن چیزوں کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً لباس، خواب گاہ وغیرہ ان میں اسے زیادہ مشقت ہو (اور پھر اسے اپنے کام کی قدر ہو کیوں کہ اگر بغیر تکلیف کے کوئی بات حاصل ہو تو اس کی قدر نہیں ہوتی اور نیز یہ بھی سبب ہے کہ) اگر آدمی کو کوئی تکلیف اور درد نہ ہوا کرتا، تو وہ بدکاریوں سے کیوں بچتا، اور اللہ کے سامنے کیوں جھکتا، اور لوگوں پر کیوں مہربانی کرتا؟

کیا تم دیکھتے نہیں کہ جب کسی کو درد کی تکلیف ہوتی ہے، فوراً اس نے خدا کے سامنے خضوع و خشوع سے سر جھکا دینا ضروری سمجھا، اور عاجزی کرنے لگتا ہے اور اپنے پروردگار کی طرف صحت حاصل کرنے کے لیے مائل ہوتا ہے اور صدقہ دینے میں اپنے ہاتھ کھول دیتا ہے۔

اور اگر آدمی کو مار کھانے سے تکلیف نہ محسوس ہوتی تو بادشاہ سرکشوں اور بدکاروں کو کس طرح سے سزا دیتا، اور بچے علوم و صناعات کیوں کر سیکھتے، (چوٹ لگنے کا ڈر تو ختم ہی ہو جاتا) اور غلام اپنے آقاؤں کے سامنے کیوں کر انکساری کرتے اور دل سے ان کی اطاعت کیوں کر کرتے۔

کیا اس میں ابن ابی العوجاء (دہریہ مذکور الصدر) اور اس کے ساتھ والوں کی جو تدبیر کے منکر ہیں اور مانویہ کی جو تکلیف اور درد کی حکمت کو مانتے ہی نہیں (یعنی کہتے ہیں کہ تکلیف جو انسان کو پہنچتی ہے اس میں کوئی حکمت اور فائدہ نہیں، بلکہ لغو بات ہے) کچھ تنبیہ و توبیخ نہیں ہے (یہ تو سب کچھ ہے مگر لاعقلی اور ہٹ دھرمی کا کیا علاج ہے؟)

حیوانات میں صرف نر یا صرف مادہ ہی کیوں نہ پیدا ہوئے؟

اگر حیوانات میں صرف نر ہی پیدا ہوتے مادہ نہ ہوتی یا صرف مادہ ہی پیدا ہوتی اور نر نہ پیدا ہوتے تو کیا نسل نہ منقطع ہو جاتی اور اس کے ساتھ حیوانات کے تمام اجناس و اصناف فنا نہ ہو جاتے۔ لہذا بعض بچے تو نر پیدا ہوتے ہیں اور بعض مادہ، تا کہ ہمیشہ نسل برقرار رہے اور یکبارگی ختم نہ ہو جائے۔

سن بلوغ پر مرد کے داڑھی کیوں نکلتی ہے؟

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مرد، عورت جب سن شعور و بلوغ کو پہنچتے ہیں تو صرف مرد کے داڑھی کیوں نکلتی ہے، عورت کے کیوں نہیں نکلتی، اگر اس میں حکمت و تدبیر نہیں تو کیا ہے؟

یہ اس سبب سے ہے کہ چونکہ پروردگار نے مرد کو حاکم اور عورت کا منتظم و نگہبان بنایا ہے اور عورت کو اس کی دلہن اور کارکن، لہذا مرد کو داڑھی عطا کی، کیونکہ اس میں عزت، جلالت اور ہیبت ہے اور عورت کو نہ دی، تا کہ اس کے چہرہ کا حسن اور تازگی باقی رہے، جو خوش فعلی اور ہم خوابی کے لیے نہایت مناسب ہے۔

کیا تم نہیں دیکھتے! کہ حکیم عزوجل کی تدبیر سے یہ خلقت کیسی کیسی خوبیاں ظاہر کرتی ہے جس میں بالکل غلطی کو دخل نہیں۔ جس قدر جس چیز کی ضرورت ہے اسی قدر مہیا

ہوتی ہے اور جس کی ضرورت نہیں ہوتی، نہیں مہیا کی جاتی۔ (مثلاً مرد کے لیے داڑھی کی ضرورت تھی وہ اسے ملی، عورت کو اس کی ضرورت نہ تھی اس کو نہ ملی۔)

مفضل کہتے ہیں کہ دوران گفتگو زوال کا وقت آ گیا۔ آقا، نماز کے لیے اٹھے اور فرمایا کہ کل صبح کو انشاء اللہ میرے پاس آنا، میں وہاں سے ان معلومات کے حاصل ہونے سے نہایت خوش خوش اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا اس نعمت پر جو اس نے مجھے دی تھی واپس آیا۔ تمام شب نہایت خوشی میں بسر کی کہ میرے آقا نے کیا کچھ مجھے عطا فرمایا، اور کیا کیا نہ تعلیم فرمائی۔

دوسری نشست

مفضل کہتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اذن حضوری لیا گیا اور میں داخل بیت الشرف ہوا۔ آپ نے مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ میں بیٹھ گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں جو گردش زمانہ کا مدبّر (یا اس کا گردش دینے والا، دور زمانہ کا یکے بعد دیگرے لانے والا) اور قرنہائے دہر کو ایک درجے کے بعد دوسرا درجہ اور ایک عالم بنا کر لانے والا ہے۔ تا کہ بدکاروں کو ان کی برائیوں کا بدلہ دے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا، اس لیے کہ وہ عادل ہے تمام نام اس کے مقدس ہیں اور نعمتیں اس کی بڑی ہیں۔ وہ آدمیوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا، لیکن انسان خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس پر خدا کا کلام گواہ ہے کہ ''جو شخص ایک ذرے کے بقدر نیکی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا، اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کا عوض پائے گا'' اس قسم کی اور آیتیں بھی اس کی کتاب (قرآن مجید) میں ہیں جس کے اندر تمام چیزوں کی تفصیل و توضیح موجود ہے۔ نہ جھوٹ اس کے سامنے آ سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے۔ وہ حکیم مطلق اور محمود کل کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب ہے'' اور اسی وجہ سے سید عالم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

﴿انما ھی اعمالکم ترد الیکم﴾

یہ تمہارے اعمال تمہیں کو واپس کر دیے جائیں گے۔ (یا یہ کہ یہ سزا و جزا تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جو تمہیں لوٹا دیا گیا۔) یعنی خدائے تعالیٰ کو کچھ ان اعمال سے فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ

ان کا فائدہ تمہیں کو قیامت میں پہنچے گا۔

پھر امام علیہ السلام نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور ارشاد فرمایا:

"اے مفضل! یہ خلق حیران وسرگردان ہے، اندھی ہے، متوالی ہے، اپنی سرکشی کے اندر چلتی ہے۔ اپنے شیطانوں اور شیطان نما لوگوں کی پیروی کرتی ہے۔ آنکھ والے تو ہیں مگر اندھے ہیں کچھ نہیں دیکھتے۔ زبان والے تو ہیں مگر گونگے ہیں، کچھ نہیں سمجھتے۔ کان والے ہیں مگر بہرے ہیں کچھ نہیں سنتے۔ پستی وحقارت میں خوش ہیں، سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت پا گئے۔ عاقلوں کے درجے سے پھرے ہوئے ہیں، گندے اور نجس "لوگوں کے" کے سبزے کو چرتے ہیں۔ (یعنی جو کہ مہمل لوگ کہتے ہیں، وہی یہ بھی کہنے لگتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کا وجود نہیں ہے عالم کی تمام چیزیں خود بخود پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ نیچر فاعل ہے یا طبیعت وغیرہ وغیرہ) گویا وہ موت کے ناگہاں آجاتے سے امن میں ہیں اور بدلہ پانے سے بچائے ہوئے ہیں۔ افسوس کس قدر بدبخت ہیں اور ان کا رنج اور ان کی تکلیف کس قدر طولانی ہوگی اور ان کی بلا کس قدر سخت ہوگی جس دن کہ کوئی دوست کسی دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا اور نہ ان کی بالکل مدد کی جائے گی۔ (یعنی قیامت کے دن) البتہ وہ جن پر اللہ ہی رحم کرے۔

مفضل کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں رونے لگا۔ آپ نے فرمایا نہ روؤ، تم تو بچ گئے، کیونکہ تم نے حق کو قبول کیا اور نجات پالی، اس لیے کہ تم نے معرفت حاصل کرلی۔

پھر فرمایا: "اب میں چاہتا ہوں کہ تم سے حیوانات کا حال بیان کروں تاکہ تم کو ویسا ہی حال ان کا بھی معلوم ہو جیسا کہ اس کے علاوہ اوروں کا حال معلوم ہوا۔

حیوانوں کی جسمانی کیفیت:

غور کرو حیوان کے بدن کی بناوٹ اور اس ہیئت وانداز میں جس پر وہ بنائے گئے ہیں نہ وہ پتھر جیسے سخت ہیں، کیونکہ اگر ایسے ہوتے تو مڑ نہ سکتے اور کاموں میں تصرفات نہ کر

سکتے اور نہ وہ نرم ہی ہیں، ورنہ پھر اٹھنا بیٹھنا دشوار ہوتا اور بلا سہارے مستقل بنفسہ قائم رہ سکتے۔ لہٰذا وہ ایسے نرم گوشت سے بنائے گئے ہیں جو با آسانی دہرے ہو سکتے اور مڑ سکتے ہیں اور ان کے اندر سخت ہڈیاں قرار دی گئیں جنہیں پٹھے تو پکڑے ہوئے ہیں اور رگیں مضبوط باندھے ہوئے ہیں اور ایک کو دوسرے سے ملائے ہوئے ہیں۔ ان ہڈیوں اور پٹھوں کے اوپر ایک جلد قائم کی گئی ہے جو تمام بدن کو محیط ہے۔

اسی کے مشابہہ یہ تصویریں (مورتیں اور کٹھ پتلیاں) ہیں جو لکڑی سے بنائی جاتی ہیں اور انہیں کپڑوں میں لپیٹتے اور ڈوروں سے باندھتے ہیں اور اس کے اوپر سے گوند کا وارنش کر دیتے ہیں، تو لکڑی کو تم ہڈیاں تصور کرو اور کپڑوں کو گوشت اور ڈوروں کو پٹھے اور رگیں اور وارنش کو جلد سمجھو، تو اگر چلتے پھرنے والے حیوانات میں ایسا ہو سکتا کہ خود بخود یہ چیزیں بن گئی ہیں (یعنی رگیں، پٹھے، گوشت، ہڈیاں اور ان کا باہم ارتباط اور تعلق) تو یہ بھی ممکن ہوگا کہ ان مردہ تصویروں میں بھی ایسا ہی ہو سکے (یعنی خود بخود ان پر وارنش پھر جائے، کپڑے لپٹ جائیں اور ڈورے بندھ جائیں) اور اگر ان مورتوں میں (کٹھ پتلیوں میں) ایسا ممکن نہیں ہے حیوانات میں بدرجہ اولیٰ ناممکن ہوگا۔

اس کے بعد ان حیوانات کے بدنوں کو غور سے دیکھو۔ چونکہ یہ آدمی کے جسموں کی طرح گوشت، ہڈی اور پٹھوں سے پیدا کیے گئے ہیں، لہٰذا ان کے کان، آنکھ بھی ہیں تاکہ آدمی اپنی ضرورت ان سے پوری کر سکے۔ کیونکہ اگر یہ اندھے یا بہرے پیدا کیے گئے ہوتے تو انسان ان سے فائدہ نہ اٹھا سکتا اور نہ یہ اس کی کسی ضرورت میں کارآمد ثابت ہوتے۔

پھر یہ کہ ان کو ذہن اور عقل کا مادہ نہیں دیا گیا۔ تاکہ آدمیوں کے مطیع رہیں اور جب وہ ان پر سخت مشقت ڈالے اور بھاری بوجھ لا دے تو یہ اس سے سرکشی نہ کریں۔

اگر یہاں پر کوئی یہ اعتراض کرے کہ انسان کے غلام بھی ہوتے ہیں اور وہ صاحب عقل ہونے کے باوجود اطاعت گزار اور فرمانبردار بھی ہوتے ہیں، محنت ومشقت کے کام بھی ان سے لیے جاتے ہیں۔ (اسی طرح ان حیوانات کو بھی عقل وذہن ملتا تو کیا حرج تھا۔ جس طرح غلام اپنے آقاؤں کے مطیع وفرمانبردار رہتے ہیں، حیوانات بھی رہتے۔)

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس قسم کے آدمی (جو غلامی کی سخت مشقت اٹھانے پر بھی مطیع وفرمانبردار رہیں، چون وچرا نہ کریں) کم ہیں، لیکن اکثر آدمی (جو غلام ہیں) وہ چکی بھی پیستے ہیں وغیرہ وغیرہ اور جن کاموں کی آدمی کو ضرورت ہے ان میں جانوروں کو کوئی بہکائے بھی، تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ ان حیوانات میں کسی کے بہکانے کا کچھ اثر پیدا ہو، بخلاف انسان کے کہ اس میں اس بات کا بدیہی اثر ہے۔)

پھر اگر (حیوانات میں عقل پیدا کی گئی ہوتی اور وہ تکلیف برداشت نہ کرنے کے سبب آدمیوں کا کام نہ کرتے، ان کے فرمانبردار نہ رہتے) اور آدمی ان کاموں کو (جنہیں حیوانات کرتے ہیں) خود ہی کرتا تو دوسرے کاموں سے معطل ہو جاتا، کیونکہ اسے ایک اونٹ یا ایک خچر کے بدلے بہت سے آدمی درکار ہوتے (جو ان کاموں کو انجام دے سکتے) یہی معمولی کام تمام آدمیوں کو ہمہ وقت مصروف رکھتے، دیگر صنعت وحرفت سے انسان محروم ہو جاتا۔

علاوہ ازیں انسانوں کو ان کاموں سے سخت تعب بھی پہنچتا اور ان کے معاش میں مشقت اور تنگی ہو جاتی۔

لہذا حیوانات کو ان کی باربرداری وغیرہ کے لیے ایسا پیدا کیا گیا کہ انہیں عقل و

شعور نہ ہو، تاکہ انسان کے حکم سے سرتابی نہ کرسکیں۔

تین قسم کے حیوانات کی تشریح:

مفضل! غور تو کرو، ان تین قسم کے حیوانات اور ان کی ساخت میں، کہ کیونکر بنے ہیں اور ہر ایک کے لیے اس قسم کی ساخت سے کیا بہتری اور خوبی ہے؟

اول انسان:

انسان کے لیے چونکہ یہ مقدر کر دیا گیا تھا کہ اس میں ذہن وذکاوت ہوگی اور معماری، نجاری، زرگری، جامہ دوزی اور دیگر پیشے اور حرفتیں کرے گا، لہذا ان کی ہتھیلیاں بڑی بنائی گئیں جن میں موٹی موٹی انگلیاں ہیں تاکہ تمام چیزوں کی گرفت کرنے پر اچھی طرح قادر ہوں اور سب سے ضروری یہی مذکورہ بالا پیشے تھے (جو بغیر چوڑی ہتھیلیوں اور انگلیوں کی مدد کے ہو ہی نہ سکتے تھے۔)

دوم درندے:

گوشت خور حیوانات کے لیے چونکہ یہ مقدر کر دیا تھا کہ ان کی زندگی شکار کے ذریعے سے بسر ہوگی تو ان کی ہتھیلیاں لطیف، سمٹنے والی، پنجوں اور تیز ناخن دار بنائی گئی، جو شکار کے تو لائق ہیں مگر صنعت وحرفت کے کام انجام نہیں دے سکتیں۔

سوم چرند:

نباتات خور حیوانات کے لیے چونکہ یہ مقدر ومعین کر دیا گیا تھا کہ نہ تو ان کے متعلق صنعت وحرفت کا کام ہوگا اور نہ شکار کا کام، لہذا بعض کو کھریاں دی گئیں جو انہیں زمین کی سختی سے محفوظ رکھیں جب کہ وہ چلنے پھرنے اور چرنے کا کام کریں اور کسی کو گول وگہرے سُم دیے گئے، جیسے چوپاؤں کے تلوے ہوتے ہیں جو زمین پر برابر پڑ سکیں، تاکہ سواری اور

بار برداری کے لیے عمدہ ثابت ہوسکیں۔

درندوں کی تشریح:

گوشت خور جانوروں کی ساخت اور بناوٹ کوغور سے دیکھو کہ ان کے تیز دانت اور سخت نوکیلے اور تیز پنجے اور چوڑے دہانے (منہ) پیدا کیے گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے لیے چونکہ یہ مقدر کردیا گیا ہے کہ گوشت ہی ان کی غذا ہو توان کی ساخت بھی اس کے مناسب ہی بنائی گئی اوران کو ایسے ہتھیاروں اور آلات سے مدد دی گئی جو شکار کے قابل ہوں۔

علیٰ ہٰذا القیاس، تم شکاری پرندوں کو بھی پاؤ گے، کہ ان کی چونچ اور پنجے ان کے کام کے قابل بنائے گئے ہیں۔

اگر یہی پنجے، وحوش (غیر شکاری) جانوروں کو دیے جاتے تو ان کے لیے بے کار ثابت ہوتے۔ کیونکہ نہ تو وہ شکار کرتے ہیں اور نہ گوشت کھاتے ہیں اور اگر درندوں کو کُھر (بجائے پنجوں کے) دیے جاتے تو جن چیزوں کی انہیں ضرورت تھی وہ انہیں نہ ملتیں یعنی وہ ہتھیار جن سے شکار کر کے اپنی زندگی بسر کرسکیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ ان دونوں قسم کے حیوانات کو وہی چیزیں ملی ہیں جو اس قسم کے لیے مناسب اور اس کے موافق ہیں، بلکہ انہیں سے اس کی زندگی ہے۔

اب چوپائے جانوروں کو دیکھو، کہ وہ کس طرح اپنی ماؤں کے پیچھے پیچھے خود بخود چلتے ہیں، اٹھانے کی ان کو ضرورت نہیں پرورش کی ان کی ضرورت نہیں، جیسا کہ آدمیوں کے بچوں کو ضرورت ہے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ان بچوں کی ماؤں کے پاس وہ آلات نہیں ہیں جو آدمی کے بچوں کی ماؤں کے پاس ہیں۔ مثلاً نرمی ولطف اور پرورش کا علم اوران بچوں کو ہاتھ اور انگلیوں کے ذریعے سے اٹھانے کی قوت جو اسی لیے بنائے گئے ہیں۔ (یہ باتیں بے چارے چوپاؤں میں نہیں ہیں) لہٰذا ان چوپائے بچوں کے لیے یہ دیا گیا کہ وہ

خود ہی اٹھیں اور اپنا کام بھی خود ہی کریں۔

اسی طرح دیگر پرندوں میں بھی پاؤ گے۔ جیسے مرغی، تیتر، کبک کے بچے اسی وقت چلنے پھرنے اور دانہ چگنے لگتے ہیں (جب کہ انڈوں سے نکلتے ہیں) لیکن وہ پرندے جو کمزور ہیں اور ان میں اٹھنے کی طاقت نہیں، جیسے دیسی اور جنگلی کبوتر اور حُمر کے بچے۔ تو ان کی ماؤں کو ان کی بہت ہی محبت دی گئی ہے کہ جب وہ اپنے پوٹوں کو بھر لیتی ہیں تو ان بچوں کے منہ میں لا کر بھراتی ہیں اور برابر کھلاتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ (بچے) خود اپنا کام انجام دے سکیں۔

اسی وجہ سے کبوتر کو بہت سے بچے نہیں دیے گئے۔ جیسے مرغیوں کے بہت سے بچے ہوتے ہیں تا کہ ان کی مائیں اپنے بچوں کے پالنے پر قادر ہوسکیں اور وہ بچے خراب اور ہلاک نہ ہوں، پس حکیم لطیف وخبیر کی حکمت کا ہر ایک کو ایک حصہ ملا ہے۔

حیوانات کی ٹانگیں جفت کیوں بنائیں

دیکھو! حیوانات کی ٹانگیں کیونکر جفت بنائی گئی ہیں؟

یہ اس لئے کہ چلنا پھرنا ممکن ہو۔ اگر طاق بنائی گئی ہوتیں تو اس (حیوان) کے قابل نہ ہوتی۔ اس سبب سے کہ چلنے والے جاندار اپنے ایک پاؤں کو اٹھاتے اور دوسرے پر سہارا لیتے ہیں، دو ٹانگوں والے ایک کو اٹھاتے اور دوسری پر ٹھہرتے ہیں اور چار ٹانگوں والے دو کو اٹھاتے ہیں اور دو پر سہارا لیتے ہیں اور یہ مختلف رخ سے ہوتا ہے، کیونکہ اگر چوپائے دونوں ٹانگیں ایک ہی طرف کی اٹھاتے اور دوسری طرف کی ٹانگوں پر سہارا لیتے تو زمین پر نہ رک سکتے جیسے چار پائی اور تخت وغیرہ صرف دو پایوں پر رک نہیں سکتے، تو ایسا ہوا کہ داہنی طرف کی اگلی ٹانگ کو اٹھائے اور بائیں طرف کی پچھلی، اور اسی طرح مخالف جہت سے باقی ٹانگوں کو اٹھائے تا کہ زمین پر قائم رہ سکے اور چلنے کے وقت گر نہ پڑے۔

اطاعت گزار چوپائے:

کیا تم گدھے کو نہیں دیکھتے کہ کیونکر بار برداری کا کام کرتا ہے اور وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ خچر اس سے زیادہ کام کرتا ہے لیکن گھوڑا آرام اور آسائش میں رکھا جاتا ہے۔

اور اونٹ تو اس قدر کام کرتا ہے کہ جتنا کئی آدمی مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ حکم نہ مانتا تو کیسا ہوتا؟ اب تو وہ ایک بچے کی بھی اطاعت کر لیتا ہے۔

اور بیل! کیونکر مالک کا فرمانبردار ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کی گردن پر جوا رکھ کر اس کے ذریعے سے زراعت کرتا ہے۔

شریف نسل کا گھوڑا تلواروں اور نیزوں میں اپنے مالک کی طرح گھس جاتا ہے۔ (اپنی جان کا خوف نہیں کرتا)

بھیڑ کے پورے گلے کو صرف ایک آدمی چرا لیتا ہے اور اگر ایسا ہوتا کہ بھیڑیں ادھر ادھر بھاگ جایا کرتیں اور ہر ایک ان میں الگ راستہ اختیار کرتی تو ایک شخص ان کے لیے ناکافی ہوتا۔

علی ہذا القیاس اور تمام قسم کے حیوانات جو انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

اسی سبب سے نا، کہ ان میں عقل نہیں، غور و فکر کی قوت نہیں، اگر ان میں عقل ہوتی اور یہ اپنے اپنے کاموں میں غور کرتے ہوتے تو یقیناً آدمی کی ضروریات کے وقت پہلوتہی اور نافرمانی کر جایا کرتے۔ اونٹ اپنے ساربان کا حکم نہ مانتا، نہ بیل اپنے مالک کا اور بھیڑیں اپنے چرواہے سے بھاگ بھاگ کر متفرق ہو جایا کرتیں۔ اور علی ہذا القیاس۔

اسی طرح یہ درندے اگر عقل و شعور رکھتے ہوتے تو آدمیوں سے عقلمندوں کی طرح مقابلہ کرتے اور ان سے جھگڑتے (کہ تم ہماری خوراک کی چیزوں پر کس طرح

قابض و متصرف ہونا چاہتے ہو) شیر، بھیڑیے، چیتے اور ریچھوں وغیرہ سے کون مقابلہ کر سکتا تھا۔ اگر وہ بھی آپس میں مل جل کر آدمیوں پر چڑھائی کر دیتے تو ان کے پاس بچنے کی کون سی راہ ہوتی؟

کیا تم نہیں دیکھتے؟ کہ یہ بات ان سے کیونکر روک دی گئی اور بجائے اس کے کہ ان سے انسان ڈرتا ہے اور وہ خود بھی آدمیوں سے خائف رہتے اور بھاگتے ہیں۔ پھر یہ بھی کہ دن میں اپنی غذا تلاش کرنے کے لیے نہیں نکلتے، رات کو نکلا کرتے ہیں۔ تو باوجود ہیبت و قوت کے بے روک ٹوک اور بغیر مار پیٹ آدمیوں سے ڈرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو ان کے گھروں میں کود پھاند کر داخل ہو جاتے اور ان کی زندگی تنگ کر دیتے۔

کتے کی حالتیں:

پھر منجملہ ان تمام درندوں کے کتے میں ایک خاص بات رکھی گئی ہے کہ اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے اور اس کی حمایت و حفاظت کرتا ہے اور اس کے گھر کی بھی حفاظت کے واسطے مکان کی چہار دیواری اور چھتوں وغیرہ پر اندھیری رات میں گھومتا پھرتا رہتا ہے چوروں سے بچاتا ہے، دوسرے کتوں کو بھی نہیں آنے دیتا، اس کی محبت اپنے مالک سے اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ خود اس کے اور اس کے گلے اور مال کے بچانے کے واسطے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے اور اس سے بے حد محبت کی وجہ سے اس کے ساتھ بھوک اور تکلیف پر صبر کرتا ہے۔ تو کتا کیوں پیدا کیا گیا، اسی لیے نا، کہ آدمی کی حفاظت کرے۔ اس کے دانت سخت ہیں، اس کے پنجے تیز اور نوکیلے ہیں اس کی آواز ڈراؤنی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

اسی لیے نا کہ چور اس سے ڈر جائے، اور جن چیزوں کی وہ حفاظت کرتا ہے ان کے پاس کوئی نہ پہنچ سکے۔

چوپاؤں کے چہروں کی کیفیت:

مفضل! چوپاؤں کے چہروں کی طرف غور کرو۔ کیونکہ بنائے گئے ہیں؟ تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں سامنے کو لگی ہوئی ہیں تاکہ کسی دیوار سے نہ ٹکرا جائیں یا کسی گڑھے میں نہ گر پڑیں اور ان کے دہانوں کو تھوتھنی کے نیچے سے پھٹا ہوا پاؤ گے۔ اگر اس طرح پھٹے ہوتے جیسے انسانوں کے منہ ہیں، ٹھوڑی کے سامنے سے تو وہ اس پر قادر نہ ہوتے کہ زمین سے کوئی چیز اٹھا سکتے وغیرہ۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ آدمی اپنے منہ سے کھانے کی چیز کو نہیں اٹھاتا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اٹھاتا ہے۔ یہ اس کو خاص شرافت دیگر کھانے والوں پر دی گئی ہے اور چونکہ چوپاؤں میں ایسے ہاتھ نہیں ہیں جن سے وہ گھاس وغیرہ اٹھا کر کھا سکیں۔ لہٰذا ان کا تھوتھنی کا حصہ نیچے کی جانب شگافتہ بنایا گیا، تاکہ گھاس کو با آسانی پکڑ سکیں اور پھر اسے چبا سکیں (اور لبے ہونٹوں سے مدد لے۔)۔

حیوانات کی دم کیوں بنائی گئی؟

ان جانوروں کی دم کو عبرت سے دیکھو! کہ اس میں کیا نفع قرار دیا گیا ہے۔ یہ ان کے بول و براز (پیشاب پائخانہ) کے مقامات کے لیے ایک قسم کا ڈھکنا ہے جو دونوں کی ستر پوشی کرے۔ اور اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کے جسم پر مکھیاں اور مچھر وغیرہ نہ جمع ہوسکیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ان کو دائیں بائیں دم کے ہلاتے رہنے سے آرام بھی ملتا ہے (گویا یہ ان کا ایک قسم کا مشغلہ ہے) اس لیے کہ، چونکہ یہ جانور اپنے چاروں پیروں پر ہی کھڑے رہتے ہیں اور اگلے دونون پاؤں بدن کو اٹھائے رہنے میں مصروف رہتے ہیں اور انہیں ادھر ادھر پھرانے کا موقع نہیں ملتا، تو ان کو اپنی دم ہلانے میں راحت ملتی ہے اور اس

میں بہت سے دیگر فائدے بھی ہیں جن کے جاننے سے وہم قاصر ہے جو اسی وقت معلوم ہوتے ہیں جب اس کی ضرورت پڑے۔

منجملہ ان فائدوں کے چوتھا فائدہ یہ بھی ہے، کہ جانور کبھی دلدل میں پھنس جاتا ہے تو اس کے نکالنے اور اٹھانے کے لیے دم سے بڑھ کر کوئی چیز کام نہیں دے سکتی۔

اور دم کے بالوں میں آدمیوں کے بھی بہت سے فائدے ہیں کہ انہیں اپنی ضرورتوں میں صرف کرتے ہیں۔

پھر ان حیوانوں کی پیٹھ مسطح اور چاروں ٹانگوں کے اوپر اوندھی ہوئی بنائی گئی تاکہ اس پر سوار ہونا یا بار برداری آسان ہو۔ ان کے مقام دخول (شرمگاہ) ان کے پیچھے کھلے ہوئے بنائے گئے، تاکہ نر کو جفتی کھانا ممکن اور آسان ہو اور اگر پیٹ کے نیچے بنایا جاتا جیسے عورت کی شرمگاہ ہے تو ان کے نروں کو جفتی کرنا ممکن نہ ہوتی۔ کیا تمہیں معلوم ہے نہیں کہ ان کے نر منہ کے سامنے سے جفتی نہیں کھا سکتے جس طرح کوئی مرد، عورت سے صحبت کر سکتا ہے۔

ہاتھی کی سونڈ کے فوائد:

ہاتھی کی سونڈ میں غور کرو اور دیکھو! کہ اس میں کیا باریک حکمت ہے؟ یہ سونڈ اس کے لیے چارہ اور پانی لینے اور پیٹ تک پہنچانے میں ہاتھ کا قائم مقام ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہاتھی کسی چیز کو زمین سے نہ اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی گردن دوسرے چوپاؤں کی طرح لمبی نہیں ہوتی کہ ادرگرد حرکت کر سکے، اسی وجہ سے سونڈ کو اس کا قائم مقام بنایا گیا، اور لمبی سونڈ ہونے کے باعث اس کو لٹکائے رہے اور اپنی ضرورت پوری کر سکے..... تو کس نے بجائے اس عضوِ معدوم (ہاتھ و گردن) کے اسے ایسی چیز دی جو اس کا بدلہ ہو سکے۔ اسی نے نا، جو اپنی مخلوقات پر نہایت مہربان ہے اور یہ بغیر پیدا کیے کیوں کر ہو سکتا تھا جیسا کہ یہ ظالم نیچری اور دہریے کہتے ہیں۔

پس اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ پھر اس کی گردن ویسی ہی کیوں نہ بنائی جیسی دیگر چوپاؤں کی ہے تو اسے یہ جواب دیا جائے گا کہ ہاتھی کا سر اور اس کے کان بہت بھاری اور ثقیل ہیں۔ اگر یہ سر اور کان لمبی گردن پر بنائے گئے ہوتے تو اسے توڑ دیتے اور سست کر دیتے۔ لہٰذا اس کا سر اس کے دھڑ (جسم) سے ملا ہوا بنایا گیا۔ تا کہ اسے وہ تکلیف نہ پہنچے جو ہم نے بیان کی ہے اور بجائے اس کے یہ سونڈ بنا دی گئی تا کہ اس کے ذریعے سے اپنی غذا حاصل کر سکے۔

پس باوجود گردن نہ ہونے کے یہ تمام ان چیزوں کو پوری طرح حاصل کر لیتا ہے جس میں اس کی ضرورت رفع ہو جائے۔

دیکھو ہتھنی (مادہ ہاتھی) کی فرج کیوں کر پیٹ کے نیچے بنائی گئی ہے مگر جب اسے شہوت ہوتی ہے تو اوپر کی جانب ابھر آتی ہے، تا کہ نر کو اس سے جفتی کھونے میں آسانی ہو۔

غور کرو! کہ ہتھنی کی شرمگاہ برخلاف اور حیوانوں کے بنائی گئی ہے پھر اس میں وہ بات رکھ دی گئی جس سے وہ امر ممکن ہو سکے جس میں اس کی نسل کی بقائے دوام ہے۔

زرافہ کی ساخت اور اس کی عجیب باتیں:

زرافہ کی ساخت کو ذرا غور کرو اور اس بات کو کہ اس کے اعضاء کیسے مختلف ہیں اور چند طرح کے حیوانوں کے اعضاء سے مشابہہ ہیں۔ اس کا سر تو گھوڑے جیسا، گردن اونٹ کی طرح، کھریاں گائے جیسی اور کھال چیتے کی طرح۔

بعض جاہلوں نے یہ گمان کیا ہے (جن کو خدائے تعالیٰ کی حکمتوں کی معرفت نہیں) کہ مختلف اقسام کے نروں کی جفتی سے اس طرح کا بچہ پیدا ہوتا ہے، ان جاہلوں نے یہ بیان کیا ہے کہ خشکی کے قسم قسم کے جانور جب پانی پینے کے لیے گھاٹوں پر جاتے ہیں تو کوئی جانور کسی سے، کوئی کسی سے جفتی کھا جاتا ہے تو اس صورت ہ بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو

مختلف قسم کے حیوانات کا گویا کہ ایک نمونہ ہے۔ یہ اس کہنے والے کی جہالت ہے اور یہ خدائے جل قدسہٗ وعز جلالہ کو پہچانتا ہی نہیں۔

کسی قسم کا جانور دوسری قسم کے جانوروں سے جفتی نہیں کھاتا، نہ گھوڑا اونٹنی سے اور نہ اونٹ گائے سے وغیرہ۔ جفتی تو صرف اس جانوروں میں باہم ہوتی ہے جو ایک دوسرے سے مشاکل و مشابہہ ہوں۔ جیسے گھوڑا گدھی سے جفتی کھاتا ہے۔ جس سے خچر پیدا ہوتا ہے اور بھیڑیا بجو سے جفتی کھاتا ہے جس سے سمع پیدا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اگر کوئی بچہ ان کی جفتی سے پیدا ہو ایک ایک عضو ہر ایک جانور کے مشابہہ ہو۔ (مثلاً، سر تو بجو جیسا ہو اور باقی جسم بھیڑیے جیسا ہو۔) جیسا کہ زرافہ میں ہے کہ ایک عضو تو گھوڑے کا ہے اور ایک عضو اونٹ کی طرح اور کھریاں گائے جیسی، بلکہ ان دونوں سے مل کر ایک تیسری قسم کا جانور بن جاتا ہے۔ جیسے تم خچر کو دیکھتے ہو کہ اس کا سر اس کے کان، اس کی پشت (پٹھ) اس کی دم، اس کے سم گدھے اور گھوڑے کے ان اعضاء کے بین بین ہیں۔ اور اس کی آواز گھوڑے کی طرح (ہنہناہٹ) اور گدھے کی آواز کے بین بین ہے۔

پس یہی اس بات کی دلیل ہے کہ زرافہ مختلف جانوروں کی باہم جفتی کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے یہ بھی ایک عجیب مخلوق ہے جس سے اس کی قدرت معلوم ہو جو کسی چیز میں عاجز نہیں۔

یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ قسم قسم کے حیوانات کا خالق جس کے جس عضو بدن کو چاہتا ہے ایک سا پیدا کرتا ہے اور جس کے اعضائے بدن کو چاہتا ہے کم کر دیتا ہے۔ بناوٹ میں جو چاہتا ہے زیادتی کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کم کر دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اس سے اس کی قدرت معلوم ہو اور یہ کہ اسے کوئی ایسی چیز جس کا وہ ارادہ کرے عاجز نہیں کر سکتی۔

زرافہ کی گردن اس قدر لمبی کیوں ہے اور اس میں اسے کیا فائدہ ہے۔ تو وہ فائدہ یہ ہے کہ اس کی چراگاہ اور اس کی پیدائش کی جگہ درختوں کے جھنڈ میں ہے جہاں اونچے اونچے، لمبے لمبے درخت پیدا ہوتے ہیں تو اسے لمبی گردن کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنے منہ سے درختوں کی پتیاں توڑ سکے اور اس کے پھلوں سے اپنی غذا بنا سکے۔

بندر کی ساخت اور اس کی حکمتیں:

بندر کی پیدائش اور اس کے اعضاء اکثر و بیشتر آدمی کے سے مشابہ ہونے پر غور کرو! یعنی سر، دونوں شانے اور سینہ اور اسی طرح اس کے باطنی اعضاء بھی انسان کے باطنی اعضاء سے مشابہ ہیں۔ علاوہ بریں اسے ذہن و ذکاء بھی دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اپنے پالنے والے کی ان باتوں کو سمجھتا ہے جس کا وہ اشارہ کرتا ہے اور اکثر انسان کو جو کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے اس کی نقل اتارتا ہے یہاں تک کہ انسانی خصلت اور اس کے شمائل و خصائل سے اپنی تدبیر ساخت میں بہت قریب ہے اور آدمی کے لیے باعث عبرت ہے کہ وہ اس بات کو سمجھے کہ میں بھی بہائم کی طینت اور مادے سے بنا ہوں، کیوں کہ انہی بہائم میں سے وہ بھی ہے جو انسان سے اس قدر قریب ہے اور یہ کہ اگر مجھ کو ذہن و عقل و گویائی میں اس پر فضیلت نہ دی جاتی تو میں بھی کسی جانور ہی کے مانند ہوتا۔

علاوہ اس کے بندر کے جسم میں کچھ اضافے بھی ہیں جن کی وجہ سے اس میں اور انسان میں فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً دہانہ (منہ)، دم اور بال جو اس کے جسم کا لباس ہیں اور یہ باتیں انسان سے اس کے ملحق اور مشابہ ہو جانے سے مانع نہ ہوتیں اگر اس کو انسان ہی کے مانند عقل، ذہن اور گویائی کی طاقت دی گئی ہوتی۔ پس صحیح حدِ فاصل اس میں اور آدمی میں صرف عقل، ذہن، اور طاقت گویائی کی کمی ہے۔

چوپاؤں کو ضروریات زندگی کی فراہمی:

اے مفضل! ذرا اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان بہائم پر دیکھو کہ ان کے بدنوں کو مختلف قسم کے بالوں کا کیسا لباس پہنایا ہے تاکہ سردی اور آفتوں کے زیادہ پڑنے سے محفوظ رہیں اور انہیں (بجائے جوتے کے) کھریاں، سم اور خف (اونٹ اور ہاتھی جیسے پاؤں ہیں) دیے تاکہ گھسنے سے بچیں۔ کیونکہ ان کے نہ تو ہاتھ ہی ہیں، نہ ہتھیلیاں اور نہ انگلیاں جن سے آدمی کی طرح کوئی کام کر کے اپنے جسم کی حفاظت کر سکیں، ان کا لباس اس کی ساخت و بناوٹ اور خلقت ہی میں بنا دیا گیا ہے۔ جوان کی زندگی تک باقی رہے اور انہیں اس کی تجدید اور بدلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ مگر انسان تو صاحب تدبیر ہے اس کے پاس ہتھیلیاں اور انگلیاں، نیز عقل وفہم وغیرہ موجود ہیں جن سے کام کر سکتا ہے۔ وہ کپڑا بنتا ہے اور سوت بھی کاتتا ہے اور اسی سے اپنے لیے کپڑا بناتا ہے اور وقتاً فوقتاً اسے تبدیل بھی کرتا رہتا ہے اور بھی اس کے لیے اس میں کئی طرح کی بہتری ہے۔ منجملہ ان تمام کاموں کے یہ ہے کہ وہ اپنے کام میں مصروف ہو کر فضول باتوں سے بچتا ہے وغیرہ، علاوہ ازیں جب چاہتا ہے اپنے کپڑے اتار کر آرام کرتا ہے۔ اپنے لباس کو اپنی صنعت کے ذریعے سے خوشنما اور عمدہ تیار کرتا ہے، جوتے اور دیگر اقسام کی صنعت و حرفت کرتا ہے جن میں اس کے اور دوسروں کے واسطے معاش اور تجارت بھی ہے۔

علی ہذا القیاس بہائم وغیرہ کے لیے ان تمام باتوں کا نعم البدل ان کے بال، سم اور کھریاں وخف وغیرہ میں رکھا گیا ہے۔

چوپاؤں کے مردوں کی حالت:

مفضل! ذرا اس عجیب خلقت کو غور کرو جو بہائم میں بنائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ

تمام بہائم جب مر جاتے ہیں تو اپنے مردوں کو اسی طرح چھپا دیتے ہیں جیسے انسان اپنے مردوں کو دفن کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ان کے مردے کیا ہوتے ہیں جو ایک بھی دکھائی نہیں دیتا، اور ایسے تعداد میں بھی نہیں ہیں کہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ بلکہ اگر ان کو آدمیوں کی بہ نسبت زیادہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اسے، ان ہرنوں، جنگلی گائے، بیلوں، گدھوں، جنگلی بکریوں اور بارہ سنگھوں کے گلوں کے ذریعے سمجھو اور نیز وہ وحوش اور مختلف طرح کے درندے، شیر، بجو، بھیڑیے، چیتے اور مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض اور زمین پر چلنے والے دوسرے جانوروں سے سمجھو اور عبرت حاصل کرو جو صحراؤں اور پہاڑوں میں رہتے ہیں،

علی ہٰذا القیاس پرندوں کے جھتے، مثلاً کوے، چکور، کلنگ، بط، کبوتر اور تمام شکاری پرندوں سے عبرت لو۔ ان سب کے مردے کہیں دکھائی نہیں دیتے، مگر وہی ایک آدھ جسے شکاری شکار کر لیتا ہے، یا درندے پھاڑ کھاتے ہیں۔ (دراصل ہوتا یہ ہے کہ) جب ان حیوانات کو اپنے مرنے کا احساس ہوتا ہے تو کسی مخفی مقام میں چھپ جاتے ہیں اور وہیں مر جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو تمام زمین ان کے مردوں ہی سے بھر جاتی، یہاں تک کہ ہوا میں بدبو پیدا ہو جاتی اور طرح طرح کی بیماریاں اور وبائیں پھیل جائیں۔ غور کرو اس بات پر جو انسان نے حیوانات ہی سے حاصل کی اور اس پہلی تمثیل (جسے خدائے تعالیٰ نے ہابیل و قابیل کے قصے میں بیان کیا ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو دیکھا کہ دو کوے لڑتے ہوئے آئے ایک نے دوسرے کو مار ڈالا اور زمین کھود کر اسے دفن کر دیا۔ اس سے قابیل نے سیکھا کہ ایک گڑھا کھودا جائے اور اس میں اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیا جائے) پر عمل کیا جسے پروردگار نے اس کے لیے قائم کیا تھا۔

جانوروں میں ادراک:

کس طرح اس مدبر عالم نے ان بہائم وغیرہ میں یہ ادراک اور طبیعت (قانون فطرت) قرار دی ہے جس کی وجہ سے آدمی ان امراض اور فسادات کی ایذا سے بچ گیا جو اس پر وارد اور واقع ہوتے۔

مفضل! ان سمجھداریوں پر غور کرو جو ان بہائم میں قرار دی گئی ہیں اور قدرتی طور پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ان کی خلقت میں داخل ہیں۔ تا کہ اس کی مخلوق ان نعمتوں سے محروم نہ رہے، مگر یہ سمجھ، عقل اور قوت مفکرہ کے ساتھ نہیں ہے (جس کی پہلے نفی کی گئی ہے)

دیکھو کہ گوزن، سانپ کو کھا جاتا ہے اور اس وجہ سے اسے سخت پیاس لگتی ہے۔ مگر پانی نہیں پیتا اس خوف سے کہ اگر اس نے پانی پی لیا تو زہر اس کے تمام جسم میں سرایت کر جائے گا اور اسے ہلاک کر دے گا۔ تالابوں کے کنارے کھڑا رہتا ہے اور اس کو پیاس سے سخت تکلیف ہوتی ہے تو بلند آواز سے چیختا ہے مگر پانی نہیں پیتا۔ اگر پی لے تو اسی دم مر جائے۔

تو دیکھو! کہ بالطبع ان جانوروں میں سخت پیاس کے روک لینے کی، اپنے ضرر کے خوف سے کس قدر برداشت رکھی گئی ہے، حالانکہ یہ ایسی چیز ہے کہ باعقل و تمیز آدمی بھی خود اسے ضبط نہیں کر سکتا۔

لومڑی (کو دیکھو کہ) جب اسے خوراک نہیں بہم پہنچتی تو اپنے تئیں مردہ بنا لیتی ہے اور اپنا پیٹ پھلا لیتی ہے اس لیے کہ پرندے اسے مردہ سمجھیں اور جونہی پرندے اس کو نوچنے اور کھانے کے لیے اس پر گرتے ہیں فوراً ان پر حملہ کرتی اور پکڑ لیتی ہے۔

پھر بتاؤ! کہ بے زبان اور بے ادراک لومڑی کو یہ تدبیر کس نے بتائی۔ اسی نے نا، جو ان طریقوں سے اسے روزی پہنچانے کا ذمہ دار ہوا ہے۔ چونکہ لومڑی اکثر ان امور کو نہیں

کر سکتی جنہیں درندے کرتے ہیں، مثلاً شکار کا مقابلہ، ان پر حملہ کرنا وغیرہ، تو اسے اس چالاکی اور حیلہ گری سے اس کے معاش کے لیے مدد پہنچائی گئی ہے۔

ڈالفن، جو آبی جانوروں اور ڈوبتے ہوئے آدمی بچا لیتا ہے۔) پرندوں کا شکار چاہتا ہے تو اس کی اس معاملے میں یہ تدبیر ہوتی ہے کہ پہلے مچھلی کو پکڑ کر مار ڈالتا ہے تا کہ وہ پانی پر ابھری رہے اور خود اس کے نیچے چھپا رہتا ہے اور پانی اچھالتا رہتا ہے کہ کہیں اس کا جسم نہ دکھائی دے، جب کوئی پرندہ اس مری ہوئی مچھلی پر گرتا ہے تو اسے اُچک کر شکار کر لیتا ہے۔

مفضل کہتے ہیں! میں نے عرض کی کہ مولیٰ اژدہے اور بادل کا کچھ حال بیان فرمائیے۔

آپؑ نے ارشاد فرمایا، ابر گویا اس پر موکل کیا گیا ہے کہ جہاں اسے پائے اچک لے۔ جیسے سنگ مقناطیس لوہے کو جذب کر لیتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنا سر زمین سے اٹھاتا نہیں، کیونکہ اسے ابر کا خوف لگا رہتا ہے اور سوائے گرمی کے دنوں کے جبکہ آسمان صاف ہو اور ابر کا ایک نقطہ بھی اوپر نہ ہو، باہر آتا ہی نہیں اور وہ بھی صرف ایک مرتبہ نکلتا ہے۔

مفضل کہتے ہیں، میں نے عرض کی، تو ابر کیوں اژدہے پر موکل کیا گیا، جو اس کی گھات میں رہتا اور جہاں اسے پائے اچک لیتا ہے۔

امام نے ارشاد فرمایا: اس لیے کہ آدمیوں کو اس کے ضرر سے بچائے۔

مفضل کہتے ہیں، میں نے عرض کی، مولیٰ آپؑ نے بہائم وحیوانات کا تو ایسا حال بیان فرما دیا، جو عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت ہو سکے۔ اب آپؑ چیونٹی، چیونٹے اور پرندوں کا حال بیان فرمائیے

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: اے مفضل سنو! اس ننھی سی چیونٹی کے منہ کو دیکھو، کیا اس

میں کسی ایسی بات کی کمی پاتے ہو جس میں اس کی بہتری اور بھلائی نہ ہو اور جو اس کے مناسب نہ ہو۔ یہ اندازہ اور صواب کہاں سے آیا؟ سوائے اس کے کہ وہی حکمت و تدبیر اس میں بھی صرف ہوئی ہے جو بڑی مخلوق اور چھوٹی مخلوق میں ہوئی ہے۔ (اسی وجہ سے جتنی چیزیں چیونٹی کے لیے ضروری ہو سکتی تھیں سب ہی اس کے واسطے پیدا کر دی گئیں۔)

دیکھو! اس چیونٹی کو کہ اپنی قوت (غذا) کے جمع کرنے لے لیے کیوں کر مجتمع اور اکٹھا ہوتی ہے۔ تم ایسا دیکھو گے کہ کئی کئی چونٹیاں جب کسی دانے کو اپنے سوراخ میں پہنچانا چاہتی ہیں تو ایسی ہوتی ہیں جیسے چند آدمی مل کر غلے وغیرہ کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ بلکہ چیونٹی کو اس بارے میں تو اتنی کوشش اور تندہی ہوتی ہے کہ آدمی ویسا نہیں کر سکتے۔

کیا تم دیکھتے نہیں کہ دانے حاصل کر کے ان کو درمیان سے دو ٹکڑے کر دیتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو (یہ دانے ان کے سوراخوں میں پانی پا کر اُگ آئیں اور ان کے کام کے نہ رہیں۔ اور جب ان دانوں کو تری پہنچ جاتی ہے تو ان کو نکال کر پھیلا دیتی ہے، تا کہ خشک ہو جائیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ چیونٹیاں ایسے مقام پر اپنا سوراخ بناتی ہیں جو بلند ہو، تا کہ پانی کی رو وہاں تک پہنچ کر انہیں غرق نہ کر دے۔ مگر یہ سب باتیں بغیر عقل وفکر کے ہیں اور ایک فطری اور قدرتی باتیں ہیں جو ان کو مصلحت کے واسطے خدائے عز وجل کی مہربانی سے ان کی خلقت میں داخل کر دی گئی ہیں۔)

اس جاندار کو دیکھو جسے لیث (شیر) کہتے ہیں اور عام لوگ اس کو اسد الذباب (مکھیوں کا شیر)۔ یہ ایک قسم کی مکڑی ہے جو مکھیوں کا شکار کرتی ہے۔ کیسی تدبیر اور حیلہ گری، اس کو اپنی تحصیل معاش کے لیے رفق اور ملائمت دی گئی ہے۔

تم دیکھو گے کہ جب اسے مکھی کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے قریب آئی، تو دیر تک اسے چھوڑے رکھتی ہے (بالکل اس سے تعرض نہیں کرتی اور نہ چال چلتی، نہ شکار کا ارادہ ظاہر

کرتی ہے (گویا خود ایک مردہ چیز ہے جس میں کچھ حس و حرکت ہی نہیں، جب مکھی کو مطمئن پاتی ہے اور خود سے اس کو غافل دیکھتی ہے تو نہایت آہستہ آہستہ رساں رساں اس کی طرف چلتی ہے جس وقت اتنی قریب پہنچ جاتی ہے کہ اسے پکڑ سکے گی تب اس پر جست لگا کر پکڑ لیتی ہے اور پھر اس طرح تمام جسم سے چمٹتی ہے کہ کہیں چھوٹ نہ جائے اور اتنی دیر تک اس کو مضبوط تھامے رہتی ہے کہ اسے محسوس ہو جاتا ہے کہ مکھی اب کمزور ہو گئی ہے۔ اور ہاتھ پاؤں اس کے ڈھیلے ہو گئے، پھر متوجہ ہوتی ہے اور اسے کسی محفوظ مقام پر لے جا کر اپنی غذا بناتی ہے اور اسی کے ذریعے سے اس کی حیات ہے۔ (اب بتاؤ کہ یہ تدبیر مکڑی کو کس نے بتائی کہ اس حیلہ گری کو کام میں لائے اور مکھی کو شکار کر کے اپنی غذا بنائے؟)

کیا مکڑی کے مادے نے اسے سکھایا، یا اس کی بغیر ادراک طبیعت نے۔ ہرگز نہیں، بلکہ کسی بڑے مدبر حکیم نے جس نے اسے پیدا کیا ہے، یہ ترکیب و تدبیر اس کی خلقت میں ودیعت فرمائی ہے۔

لیکن باقی (عام) مکڑی، تو وہ جال تنتی ہے اور اسے مکھیوں کے شکار کا جال اور پھندا بناتی ہے اور خود اس کے اندر چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ جونہی مکھی اس میں پھنستی ہے اس کو لپک کر دم بدم کاٹنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی زندگی اسی طرح بسر ہوتی ہے۔

اسی طرح لوگ شیر وغیرہ کے شکار کے لیے جال اور پھندے کے صید کا بھی بیان کرتے ہیں۔ (یعنی جو تدبیر انسان اپنی عقل سے شکار کے لیے اختیار کرتا ہے مکڑی بھی باوجود بے عقل و ادراک ہونے کے محض اپنی فطرتی اور قدرتی ودیعت شدہ قوت سے وہی تدبیر اختیار کرتی ہے۔)

تو دیکھو! کہ اس کمزور جانور کی طبیعت میں کیونکر وہ بات رکھی گئی ہے جسے انسان بغیر حیلہ و تدبیر اور استعمال آلات نہیں کر سکتا! تم کسی چیز کو عیب نہ لگاؤ جب کہ کوئی اثر عبرت

موجود ہو۔ جیسے چیونٹی، چھوٹے وغیرہ (یعنی ان کو حقیر نہ سمجھو)۔ (اس کلام سے حضرت کا مقصود یہ ہے کہ چیونٹی وغیرہ چھوٹی چھوٹی مخلوقات خدا کو حقیر نہ سمجھو، ان میں بھی عجیب و غریب حکمتیں اور صناعیاں (صنعتیں) ہیں جو ان کے خالق نے ان میں ودیعت فرمائی ہیں جن میں انسان غور کرنے کے بعد بڑی بڑی عبرتیں حاصل کر سکتا ہے۔) کیونکہ کبھی کسی نفیس مطلب کی مثال ایسی حقیر اور چھوٹی چیز سے بھی دی جاتی ہے تو اس سے اس نفیس مطلب کی قدر کچھ کم نہیں ہو جاتی۔ جیسے سونا، لوہے کے باٹ سے (یا پیتل کے باٹ سے) تولا جاتا ہے تو اس تولنے سے سونے کی قدر و قیمت کم نہیں ہو جاتی۔

پرندوں کی پرداخت:

اے مفضل! پرندوں کے جسم اور ان کی بناوٹ پر غور کرو، چونکہ ان کیلئے یہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ فضائے آسمان میں اڑا کریں، اس لیے ان کے اجسام ہلکے اور سمٹے ہوئے بنائے گئے، چار پیروں کے بدلے صرف دو پیر اسے دیے گئے اور پانچ انگلیوں کے بدلے صرف چار، اور بیٹ اور پیشاب کے دو سوراخوں کے بدلے صرف ایک سوراخ جو دونوں کام دے سکتا ہے۔ پھر اس کو سینہ تیز (اور باریک) دیا گیا کہ اس طرف کی ہوا کو کاٹ سکے جدھر جانا چاہے جیسا کہ کشتی بنائی جاتی ہے جسے پرندے کی صورت پر بنایا گیا ہے تاکہ پانی کو بآسانی کاٹ سکے اور اس پر چل سکے۔

پرندے کے بازوؤں اور دم میں لمبے لمبے مضبوط پر پیدا کیے گئے تاکہ ان کے ذریعے سے اڑنے کے لیے بلند ہو سکے اور تمام بدن پروں سے ڈھانپ دیا گیا، تاکہ اندر ہوا بھر کر اسے بلند کرے اور چونکہ اس کیلئے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ غذا اس کی دانے اور گوشت سے ہوں جسے وہ بغیر چبائے صرف نگل جائے تو اس کی خلقت میں سے دانت کم کر دیے گئے اور سخت چونچ ٹٹولنے والی پیدا کی گئی جس سے وہ اپنے کھانے کی چیزوں کو اٹھا

سکے، نہ دانوں کو اٹھانے سے تھک جاتی، اور نہ گوشت کو نوچنے سے ٹوٹ جاتی ہے اور چونکہ اس کے دانت نہیں ہیں بلکہ کھڑا دانہ نگل جاتا ہے اور کچا گوشت کھا جاتا ہے اس لیے اس کے پیٹ کے اندر بہت زیادہ حرارت پیدا کی گئی جو اس کی غذا کو خوب گلا دے۔ جس کی وجہ سے چبانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

اسے اس طرح سمجھ لو، کہ انگور وغیرہ کے بیج تو آدمی کے پیٹ سے سالم نکل آتے ہیں مگر پرندوں کے پیٹ میں ایسے گل جاتے ہیں کہ ان کا اثر بھی نہیں رہتا (اس سے ثابت ہوا کہ پرندوں کے پیٹ یا پوٹے میں ایسی حرارت ہے جو سخت سے سخت بیج اور دانوں کو بھی گلا دیتی ہے۔)

پھر وہ ایسے بھی بنائے گئے ہیں کہ انڈے ہی دیا کریں، بچے نہ جنیں تاکہ اڑنے میں ان کو گرانی نہ ہو، کیونکہ اگر بچہ اس کے پیٹ میں اتنے دنوں تک ٹھہرتا کہ مضبوط ہو جائے تب پیدا ہوتا اسے بہت گرانی ہوتی اور اڑنے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔ لہذا اس کی خلقت اور ساخت کی ہر چیز اسی مناسبت سے پیدا کی گئی ہے جس صورت سے اس کا ہونا مقدر ہو چکا ہے۔

پھر یہ بھی مقدر ہوا کہ یہ فضائے آسمانی میں اڑنے والا پرندہ (جس کی فطرت اڑنے ہی کے لیے بنائی گئی ہے) اپنے انڈوں پر بیٹھے اور ایک یا دو ہفتے یا تین ہفتے تک اپنے پروں کے نیچے رکھے تاکہ بچہ نکلے پھر وہ کیسا اس پر ہمہ تن متوجہ ہوتا اور اسے ہوا بھراتا ہے تاکہ اس کا پوٹہ غذا کے واسطے وسیع ہو جائے۔ پھر اسے پرورش کرتا ہے اور ایسی چیز سے غذا دیتا ہے جس سے وہ زندہ رہ سکے۔

کس نے؟ یہ کام اس کے متعلق کیا کہ پہلے دانے چنے پھر جب اس کے پوٹے کے اندر ٹھہرے تو اسے نکالے اور اس سے اپنے بچے کو بھرائے اور کیوں وہ اس مشقت کا متحمل ہوتا ہے؟ حالانکہ نہ اس کے لیے غور فکر کی طاقت دی گئی ہے اور نہ اسے وہ امید ہی ہے

جو انسان کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے۔ مثلاً عزت، بخشش، اور بقائے نام و نسل وغیرہ۔ یہ ایسا فعل ہے جو گواہی دے رہا ہے کہ کسی خاص ایسے سبب سے خدائے تعالیٰ جل جلالہٗ کی عنایت سے اس کے بچے کیلئے معطوف ہوا ہے۔ (پرورش کا سبب ہوا ہے) جسے وہ پرندہ خود نہیں جان سکتا اور نہ اسے اس کا فکر و غور ہے، وہ کیا ہے؟ یعنی وہ دوام و بقائے نسل ہے۔

مرغی کو دیکھو کہ انڈے سینے اور بچے نکالنے کے لیے کیسی بے قرار ہوتی ہے، حالانکہ نہ اس کے انڈے یکجا ہوتے ہیں اور نہ اس کا کوئی خاص گھونسلا ہے، بلکہ اُبھرتی اور پھولتی اور کڑکڑاتی ہے۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہے۔ جب تک کہ اس کے پاس انڈے نہ جمع کر دے جائیں جن سے وہ بچے نکال سکے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اسی لیے نا، تاکہ اس کی نسل رہے (ورنہ اسے اس قدر کوشش کی کیا ضرورت تھی) اور اگر قدرتاً اس میں یہ بات پیدا نہ کی گئی ہوتی تو کون اس کو نسل کی بقاء پر مجبور کرتا؟ حالانکہ نہ اس میں ادراک ہے نہ غور و فکر کی قوت (جس سے وہ سمجھتی کہ مجھے انڈے سینے چاہیئں تاکہ ان سے بچے نکلیں اور میری نسل قائم رہے۔)

انڈے کی ساخت اور اس کے اندر کی بستہ زردی اور رقیق سفیدی پر غور کرو، کہ ایک حصہ تو اس لیے بنایا گیا ہے کہ اس سے بچہ پیدا ہوا اور ایک حصہ اس لیے بنایا کہ اس کی غذا بنے جب تک کہ وہ انڈے سے نکل نہ آئے۔ (زردی سے بچہ بنتا ہے اور سفیدی اس میں جذب ہوتی ہے اور وہی اس کی غذا بنتی ہے) دیکھو! کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ از بس کہ اس بچے کی خلقت اس محفوظ چھلکے کے اندر قرار پائے جس میں کوئی بیرونی چیز داخل نہیں ہو سکتی تو اس کی غذا اس کے اندر ہی قرار دی گئی۔ جو اس کے نکلنے کے وقت تک کے لیے کافی ہو سکے، کسی شخص کو جب ایسے سخت قید خانے میں بند کرتے ہیں جس میں کوئی جانے نہ پائے، تو اس کے پاس اس قدر خوراک بھی رکھ دی جاتی ہے جو اس کے قید خانے سے نکلنے

کے وقت تک کے لیے کافی ہو (اسی طرح انڈے کے اندر بچے کے لیے غذا کا سامان یعنی انڈے کی سفیدی پیدا کی گئی، جو اس میں جذب ہو کر اس کی غذا بنے۔)

پرندے کے پوٹے اور اس حکمت پر غور کر، جو اس میں قائم کی گئی ہے، چونکہ سنگدانے میں غذا کے جانے کا راستہ تنگ ہے تھوڑی تھوڑی کر کے غذا اس میں پہنچتی ہے تو اگر ایسا ہوتا، کہ پرندہ دوسرا دانہ تو چگنے نہ پائے کہ پہلا دانہ سنگدانے میں پہنچ جائے تو اسے بڑی دیر لگتی، اور چونکہ وہ اپنی نہایت ہی دور اندیشی سے جلدی جلدی اپنے کھانے کی چیز کو بھر لیتا ہے۔ تو اس کا پوٹہ ایسا بنایا گیا جیسے توبرہ جو اس کے آگے لٹکا ہوا ہے تاکہ جو کچھ اسے کھانے کے لیے ملے جلدی سے اس میں بھر لے، پھر آہستہ آہستہ سنگدانہ (جو خاص ہضم کرنے کے واسطے بنایا گیا ہے۔) تک پہنچائے۔

پوٹے میں ایک اور بھی فائدہ ہے، وہ یہ کہ بعض پرندوں کو اپنے بچے بھرانے کی ضرورت ہوتی ہے تو ایسی صورت میں غذا کا بچے کے پوٹے کی طرف قریب سے لوٹا دینا آسان ہوتا ہے۔ (برخلاف اس کے اگر اس کے دانے پیٹ میں جا کر جمع ہوا کرتے پھر بچوں کو بھرانے کے واسطے پیٹ کے اندر سے نکال کر بچے کے منہ میں بھرنا بہت دشوار ہوتا، لہٰذا ایسا مقرر ہوا کہ یہ پرندے دانوں کو پوٹے میں بھر لیں اور قریب ہی سے اپنے بچوں کو بھرا سکیں)

مفضل کہتے ہیں ...... میں نے عرض کی کہ معطلہ فرقے میں سے کچھ لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ رنگوں اور شکلوں کا پرندوں میں مختلف ہونا محض عناصر و اخلاط کے امتزاج اور ان کی مقدار کی کمی بیشی کی وجہ سے ہے۔ کسی نے خاص طور پر ایسا نہیں بنایا ہے۔ (پرندہ مختلف رنگوں کا ہو اور مختلف طرح کی شکلیں ہوں، جیسے مور، چتلے مرغ، تیتر وغیرہ بلکہ ان کے رنگوں کا اختلاف صرف مادے کی کمی بیشی کی وجہ سے ہے۔)

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: یہ گلکاریاں جسے تم مور، اور دراج (تیتر) وغیرہ میں دیکھتے ہو اور یہ تدریجی برابر اور مقابلہ (کہ اگر ایک طرف دو انگل سرخ ہے تو دوسری طرف بھی ایسا ہی ہوگا۔ ایک بازو میں جو پر رنگین اور جس صفت کا ہے، دوسرے بازو میں بھی اسی نمبر کا پر اسی رنگ اور صفت کا ہوگا۔ جتنے چڑھاؤ، اتار ایک جانب ہے اتنا ہی دوسری جانب بھی ہے۔) جیسے کوئی شخص قلم سے نقشبندی اور مصوری کرتا ہے۔ اسے یہ امتزاج (باہمی امتزاج عناصر) مہمل (بے عقل و شعور) ایسی شکل پر جس میں کچھ اختلاف نہ ہو کیوں کر بنا سکتا ہے اگر یہ رنگینیاں اور گلکاریاں بغیر کسی صانع کے ہوتیں تو ان میں نسبت مساوات نہ رہتی اور اختلاف ہوتا (حالانکہ ہم کس حسن و دلفریبی کے ساتھ ان رنگ آمیزیوں کو پرندوں میں دیکھتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر حکیم نے نہایت ہی صنائی اور حکمت سے ان میں ایسے ایسے رنگوں کو رنگ آمیز کیا ہے۔)

پرندے کے پر کو غور سے دیکھو کہ کیونکر بنا ہے؟

تم اسے ایسا دیکھو گے جیسے کپڑا باریک تیلیوں سے بنا جاتا ہے اسی طرح بنے ہوئے ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، جیسے ایک ڈورا دوسرے ڈورے سے ایک بال دوسرے بال سے۔

پھر تم اس بناوٹ کو دیکھو کہ جب تم اسے کھولو تو تھوڑا کھل جاتا ہے اور پھٹ نہیں جاتا، تاکہ اس میں ہوا بھر سکے اور جب وہ اڑنا چاہے اڑ سکے۔ اور پر کے بیچ میں تم ایک مضبوط موٹی سینگ (سلائی) دیکھو گے جس پر بالوں کے مانند ایک چیز بنی گئی ہے تاکہ وہ اپنی سختی کی وجہ سے اسے تھامے رہے اور وہ سینگ پر کے اندر ایک سوراخ دار چیز اور کھوکھلی ہے تاکہ پرندے کو بار نہ ہو، اس کو اڑنے سے روک نہ سکے۔

کیا تم نے اس لمبی ٹانگوں والے پرندے کو بھی دیکھا ہے اور یہ بھی سمجھے ہو کہ اس

کی ساقیں (پنڈلیاں) لمبی ہونے سے کیا فائدہ ہے؟ اکثر یہ پرندہ پانی کی کم گہرائی کے مقام پر ہوتا ہے، تم اسے دیکھتے ہو گے کہ اپنی لمبی لمبی ساقوں سے گویا ایک مقام پر بیٹھ کر نگہبانی کر رہا ہے، اور وہ غور کرتا رہتا ہے کہ پانی میں کیا چیز چلی۔ پس جب کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہے جو اس کی غذا کے قابل ہے تو آہستہ آہستہ چند قدم چل کر اسے پکڑ لیتا ہے اور اگر اس کی ساقیں چھوٹی ہوتیں اور پھر شکار کی طرف اس کے پکڑنے کے لیے چلتا تو اس کا پیٹ پانی سے مل جاتا اور پھول جاتا تو وہ اس سے خوف کھا کر الگ ہو جاتا۔ لہٰذا اس کے لیے یہ دو عمود بنائے گئے کہ اپنی ضرورت پوری کر سکے اور اس کے مطلب میں کچھ خرابی نہ پڑے۔

پرندے کی خلقت میں جو کئی طرح کی حکمتیں صرف کی گئی ہیں ان پر غور کرو۔ تم ہر لمبی ساقوں (پنڈلیوں) والے پرندے کو دیکھو گے کہ اس کی گردن بھی لمبی ہے، یہ اس غرض سے کہ زمین سے اپنی خوراک اٹھا سکے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لمبی گردن کے بدلے بڑی سی چونچ بنا دی جاتی ہے تاکہ اس سے مزید سہولت ہو جائے۔

کیا تم ایسا نہیں دیکھتے کہ مخلوقات میں سے جس چیز کو تلاش کرو اسے نہایت ٹھیک و درست اور حکمت کے ساتھ پاؤ گے (ضرور ایسا ہی ہے۔ مخلوقات میں کوئی ایسی چیز نہیں معلوم ہوتی جس میں انواع و اقسام کی حکمتیں نہ صرف کی گئی ہوں جو بالکل اس شے کے مناسب ہی نہ ہوں۔)

پرندوں کی خوراک:

ان جڑی بوٹیوں کو دیکھو جنہیں یہ پرندے دن میں تلاش کرتے ہیں، نہ تو ایسا ہوتا ہے کہ نہیں مل ہی سکیں اور نہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی جگہ رکھی ہوئی دستیاب ہو جائیں، بلکہ تلاش کرنے اور چلنے پھرنے سے دستیاب ہوتی ہیں، یہی حالت دوسری مخلوقات کی بھی ہے۔ سبحان اللہ۔ وہی قابل تسبیح و تقدیس ہے جس نے روزی معین کی، کس کس طرح

سے ان کو قوت (روزی) پہنچائی اور ایسا نہ کیا کہ یہ اس پر قادر بھی نہ ہو سکے، کیونکہ خلقت کو اس کی احتیاج ہے اور نہ ایسا بنایا کہ عام طور پر ہر جگہ آسانی سے مل جائے، کیونکہ اس میں کوئی بہتری نہیں ہے اس لیے کہ اگر غذا اکٹھی ایک ہی جگہ مل جایا کرتی تو بہائم اسی میں لوٹا کرتے اور وہاں سے جدا ہی نہ ہوتے۔ یہاں تک کہ بدہضمی پیدا ہو جاتی اور پھر مر جاتے اور انسان بھی فراغت و اطمینان کی وجہ سے نہایت کبر و نخوت میں پڑ جاتے تو بہت سے فسادات پیدا ہوتے اور فواحش میں اضافہ ہونے لگتا۔ اس لیے ایسا بنایا گیا کہ اشیائے غذا ہر قسم کے جانداروں کی متفرق مقامات سے حاصل ہوں تاکہ ان کی تلاش میں ان جانداروں کی ورزش بھی ہوتی رہے، حرکت کی وجہ سے ان کی غذا ہضم ہو جائے فکر و خیال کی وجہ سے ان کو نخوت کا بھی موقع نہ ملے۔

تم کچھ جانتے ہو کہ وہ پرندے جو صرف رات ہی کو نکلا کرتے ہیں جیسے الو، کیڑے مکوڑے، اور چمگادڑ وغیرہ ان کی خوراک کیا ہے؟

مفضل کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی مولا مجھے تو معلوم نہیں

امام علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ان حیوانات کی خوراک وہ انواع و اقسام کے کیڑے ہیں جو اس فضا میں پھیلے ہوئے ہیں مثلاً مچھر، پروانے، اور ٹڈیوں کی صورت کے پتنگے اور مکڑیاں وغیرہ، یہ تمام جانور فضائے آسمان میں پھیلے رہتے ہیں، کوئی مقام ان سے خالی نہیں رہتا، اسے اس طرح سمجھ لو کہ رات کو کسی چھت پر یا صحن خانہ میں چراغ روشن کرتے ہو تو اس قسم کے بہت سے کیڑے اس پر جمع ہو جاتے ہیں، یہ سب کہاں سے آتے ہیں؟ قریب ہی سے تو آتے ہیں، اگر کوئی یہ کہے کہ جنگلوں اور میدانوں سے آتے ہیں تو اس کو جواب دیا جائے گا کہ اسی وقت اتنی دور سے کیوں کر آ پہنچتے ہیں اور اتنے فاصلے سے چراغ کو کیسے دیکھتے ہیں جو کسی ایسے مکان میں روشن کیا گیا ہے جس کے اطراف اور بہت سے مکانات ہیں۔ باایں

ہم یہ تو چشم دید بات ہے کہ یہ کیڑے قریب ہی سے چراغ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کے سب فضائے آسمانی کے ہر مقام میں پھیلے ہوتے ہیں اور شب کے نکلنے والے پرندے جب نکلتے ہیں تو انہیں پکڑ پکڑ کے اپنی غذا بناتے ہیں۔

دیکھو ان پرندوں کے لیے اس قسم کے فضا میں پھیلے ہوئے کیڑے مکوڑوں سے کیوں کر روزی پہنچانے کا راستہ نکالا گیا ہے۔

بعض حیوانات کی خلقت کی حکمتیں:

اس کے ساتھ ساتھ ان حیوانات کے پیدا ہونے کی غرض بھی سمجھو! شاید کوئی خیال کرنے والا یہ خیال کرے کہ یہ فضول پیدا ہوئے ہیں ان سے کوئی فائدہ ہی نہیں۔

خفاش کو تو ایک عجیب الخلقت جانور پیدا کیا ہے جو پرندے اور چوپائے کے بین بین ہے، بلکہ چوپاؤں سے زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ اس کے دو کان اوپر کو نکلے ہوئے ہیں، دانت ہیں، باریک رونگٹے ہیں، بچے جنتا ہے، دودھ پلاتا ہے، بول و براز کرتا ہے، جب چلنا چاہتا ہے تو چاروں پاؤں سے چلتا ہے، یہ سب صفتیں پرندے کے برخلاف ہیں پھر یہ شب ہی کو نکلتا ہے اور ان کیڑوں اور پتنگوں کو اپنی غذا بناتا ہے، جو جو السماء (یعنی فضائے آسمانی) میں منتشر ہیں، کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ چمگادڑ تو کچھ کھاتی ہی نہیں۔ اس کی غذا صرف ٹھنڈی ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات دو وجوہات سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پیشاب، پاخانہ دفع ہوتا ہے، یہ بات بغیر غذا کے ہو ہی نہیں سکتی، دوسرے اس کے دانت ہیں، اگر یہ کچھ نہ کھاتا ہوتا، تو دانت اس کے بالکل بے کار تھے۔ حالانکہ خلقت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔

لیکن اس جانور (چمگادڑ) کے وجود کے فائدے تو مشہور ہی ہیں، اس کی بیٹ بعض عملی چیزوں میں داخل کی جاتی ہے اور بڑی غرض تو اس کی وہ عجیب و غریب ساخت اور

خلقت اور اپنی مصلحت اور فائدے کے لیے اس کا آنا جانا، جہاں چاہے اور جس طرح چاہے، جو خالق جل شانہٗ کی قدرت کو بتا رہی ہے۔

اور وہ پرندہ جسے ابن تمرہ (غالباً اس سے مراد وہ پرندہ ہے جسے ہندوستان میں پیا کہتے ہیں) کبھی کبھی درختوں پر آشیانہ بناتا ہے جب کسی بڑے سانپ کو دیکھتا ہے کہ اس کے گھونسلے کی طرف متوجہ ہوا، اور اس کو نگل جانے کے لیے اپنا منہ کھولا، تو نہایت بے چین ہوتا ہے اور کوئی تدبیر بچنے کی کرتا ہے تو وہ جلدی سے اڑ کے حسکہ (خار خشک جسے گوکھرو کہتے ہیں) اٹھا لاتا ہے اور سانپ کے منہ میں اوپر سے ڈال دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے سانپ لوٹنے لگتا ہے اور بالآخر اس کی تکلیف سے مر جاتا ہے۔

اگر میں تم سے یہ بات نہ بیان کرتا تو کیا تمہارے یا کسی اور کے دل میں اس کا خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا، کہ حسکہ (پیا) میں یہ بڑی منفعت ہے یا کوئی سمجھ سکتا تھا کہ کسی چھوٹے یا بڑے پرندے کو یہ تدبیر سوجھ سکتی ہے۔

اس سے عبرت حاصل کرو، اور اسی طرح بہت سی چیزیں ہیں جن میں غیر معلوم فوائد ہیں جو بغیر کسی نئے واقعے کے جو بیان کیا جائے یا کسی خبر کے جو سنی جائے معلوم نہیں ہو سکتے۔

شہد کی مکھی کو دیکھو اور غور سے شہد کے بنانے پر ان کی اجتماعی کوشش سے جمع ہونے اور چھ پہلوؤں کا گھر بنانے پر تفکر کرو، اور یہ کہ اس میں فطانت (ذہانت) کی کیا کیا باریکیاں ہیں؟ جب تم اس کے کام پر غور کرو گے تو تمہیں نہایت عجیب و لطیف معلوم ہوگا۔ اور جب ان کی بنائی ہوئی چیز دیکھو گے تو بہت قابل عظمت پاؤ گے۔ جو آدمیوں کے لیے کیسی اچھی ذائقہ دار صحت بخش مصرف کی چیز ہے؟ اور جب اس کام کے کرنے والے کہ جس نے ایسا با قاعدہ مکان بنایا اور جس نے پھولوں کے عرق سے شہد تیار کی اور موم بنایا،

یعنی شہد کی مکھی کو دیکھو گے تو اسے نہایت ہی غبی (نا سمجھ) پاؤ گے جو اپنے تئیں بھی نہیں سمجھ سکتا، چہ جائیکہ اور چیزیں۔

پس اس میں صاف اور کھلی ہوئی دلیل اس بات کی موجود ہے کہ اس کی صنعت کی یہ درستی اور حکمت اس مکھی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ اس کی حکمت ہے جس نے انہیں اس فطرت پر پیدا کیا ہے اور آدمیوں کی مصلحت کے لیے اس کام پر اسے مجبور کر دیا ہے، (تا کہ وہ شہد بنایا کرے جس سے انسان فائدہ اٹھائے اسے اپنے علاج میں صرف کر سکے۔ اس کے ذائقہ سے محظوظ ہو سکے۔)

اس ٹڈی کو دیکھو گے تو کمزور پاؤ گے لیکن قوی بھی ہے۔ جب تم اس کی خلقت اور ساخت کو دیکھو گے اسے بہت ہی کمزور پاؤ گے اور اگر اس کا لشکر کسی مقام پر آ پڑے تو نہایت قوی و طاقتور پاؤ گے۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ روئے زمین کے بادشاہوں میں سے اگر کوئی بادشاہ اپنے لشکر کو ٹڈیوں کے لشکر سے بچانے کے لیے جمع کرے تو وہ اس پر قادر نہ ہوگا۔

کیا یہ بات قدرت خالق پر دلیل نہیں ہے کہ وہ اپنی کمزور ترین مخلوقات کو قوی ترین مخلوقات پر بھیج دے اور وہ اس کے دفعیہ پر قادر نہ ہو۔ اسے دیکھو! کہ روئے زمین پر کیسے سیل کی طرح آ پڑتی ہے اور کوہ و صحرا، میدان و شہر سب کو گھیر لیتی ہے یہاں تک کہ اس کی کثرت سے آفتاب کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی ہے۔

بتاؤ کہ اگر یہ ٹڈیاں ہاتھ سے بنائی جاتیں تو کب اس کثرت سے جمع ہو سکتی تھیں اور کتنے برس اس کے لیے درکار ہوتے اور ایسی بن بھی نہ سکتی تھیں۔ اس سے پروردگار نے اپنی قدرت کا ثبوت دیا ہے جس قدرت کو کوئی شئے عاجز نہیں کر سکتی اور نہ اسے کوئی چیز زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

مچھلی کی خلقت اور ان مناسبتوں کو دیکھو کہ جس حالت پر اس کا ہونا اور رہنا مقدر ہو چکا ہے کس طرح اس میں موجود ہیں۔

(۱) اسے ٹانگیں نہیں دی گئیں، کیونکہ اس کو چلنے کی ضرورت نہ تھی اس کا مسکن پانی قرار دیا گیا۔

(۲) اس کے پھیپھڑے نہیں پیدا کیے گئے کیونکہ اسے سانس لینا ممکن نہیں۔ (اگر سانس لیتی تو پیٹ میں اس کے پانی بھر جایا کرتا اور مر جاتی) جبکہ وہ سمندر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

(۳) اسے ٹانگوں کے بدلے سخت ترین پر دیے گئے جن سے وہ دونوں طرف پانی کو کاٹتی ہے جیسے ملاح چپوؤں سے کشتی کے دونوں طرف پانی کاٹتا ہے۔

(۴) اس کے جسم کو موٹے چھلکوں کا لباس پہنایا گیا جو ایک دوسرے کے اندر داخل ہیں جیسے زرہ یا جوشن کی کڑیاں، تا کہ اپنے تئیں آفتوں سے بچا سکے۔

(۵) سے قوت شامہ نہت ہی زیادہ دی گئی۔ اس لیے کہ نظر اس کی کمزور ہے اور پانی اسے روکتا ہے تو کھانے کی چیز کو دور سے سونگھ لیتی ہے اور پھر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے ورنہ کیونکر اسے محسوس کر سکتی (کہ کھانے کی چیز کیا ہے اور کہاں ہے؟)

(۶) اور (یہ بھی) جان لو، کہ اس کے دہانے سے لے کر دونوں کانوں تک سوراخ بنائے گئے ہیں، منہ سے تو پانی پیتی اور اس راہ سے نکال دیتی ہے اور اس طرح روح کی ترویح و آسائش کرتی ہے جیسے دیگر حیوانات ٹھنڈی ہوائے صبح سے ترویح روح حاصل کرتے ہیں۔

اب اس کی نسل کی زیادتی کو اور اس کی خصوصیت کو سمجھو اور غور کرو۔ تم ایک مچھلی

کے پیٹ میں اتنے انڈے پاؤ گے جن کا شمار نہیں ہوسکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ دیگر جانوروں کی غذا میں اس کی وجہ سے زیادتی ہو جائے۔ کیونکہ اکثر حیوانات مچھلیوں ہی کو کھاتے ہیں، یہاں تک کہ درندے بھی جھاڑیوں کے اندر پانی کے کنارے مچھلیوں کی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں جیسے ہی کوئی مچھلی اس کے قریب سے گزرتی ہے تو یہ فوراً اُچک لیتا ہے۔

پس چونکہ درندے بھی مچھلیاں کھاتے ہیں اور پرندے بھی مچھلیاں کھاتے ہیں اور آدمی بھی اس کو اپنی غذا بناتا ہے، خود مچھلیاں بھی مچھلیوں کو کھاتی ہیں، (بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔) تو اس میں حکمت یہی ہے کہ جس کثرت سے اب ہیں اسی قدر آئندہ ہوں۔

پھر اگر تم کو خالق عالم کی وسعت، حکمت اور مخلوقین کے کمی علم کو جاننا مقصود ہو تو دریا کے وہ انواع واقسام کی مچھلیوں، آبی حیوانات، سیپ اور دوسرے جانوروں کو دیکھو جن کا شمار نہیں ہوسکتا اور نہ جن کے فائدے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر یکے بعد دیگرے جنہیں انسان ان ذریعوں سے معلوم کرتا ہے جو پیدا ہوتے رہتے ہیں، مثلاً قُرمُز ہے کہ اس کے رنگ کو لوگوں نے یوں جانا کہ ایک مادہ سگ دریا کے کنارے دوڑ رہی تھی اسے ایک چیز ملی جیسے حلزون (یہ ایک کیڑا ہے جو اونٹوں کی چراگاہ میں ہوتا ہے اور رنگ دیتا ہے) کہتے ہیں۔ تو اس کو کھالیا، اس سے اس کا دہانہ رنگین ہو گیا۔ لوگوں کو جو یہ اچھا سا رنگ معلوم ہوا تو قُرمُز (جھاؤ کا کیڑا ہے جس سے ریشم کو رنگتے ہیں) کو رنگ بنالیا اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں جسے لوگ وقتاً فوقتاً اور زمانہ فزمانہ معلوم کرتے ہیں۔ (اور بہت سی ایسی ہی چیزیں ہیں جو اب تک معلوم نہیں ہوئیں۔)

مفضل کہتے ہیں: اتنے میں زوال کا وقت قریب آ گیا اور مولیٰ نماز کے لیے اُٹھے اور فرمایا۔ کل سویرے صبح کو انشاء اللہ تعالیٰ آنا۔

میں وہاں سے واپس آیا، اور ان علوم کی وجہ سے جو حضرت علیہ السلام نے مجھے تعلیم فرمائے تھے بے انتہا خوش تھا، آپ علیہ السلام کے اس عطیہ پر بہایت مسرور اور خدا کے اس انعام پر شکر کرتا تھا، اور وہ شب بہت ہی خوشی میں بسر کی۔

تیسری نشست

مفضل کہتے ہیں کہ جب تیسرا دن ہوا، صبح سویرے ہی میں اپنے مولیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے لیے اجازت مانگی گئی، میں داخل بیت الشرف ہوا آپؑ نے مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا میں بیٹھ گیا۔ پھر آپؑ نے ارشاد فرمایا:

الحمد لله الذى اصفانا و لم يصطف علينا اصفانا بعلمه و ايدنا بحلمه من شذعنا فالنار ماواه و من تفيأ بظل دوحتنا فالجنة مثواه.

اے مفضل! میں نے تمہارے سامنے انسان کی خلقت اور جس خدا نے اس کی اصلاح وتدبیر فرمائی ہے اور اس کے حالات کا متغیر ہونا اور جو اس میں عبرت ہے مفصل بیان کر دی اور حیوانات کے حالات کی بھی تشریح کر دی، اب میں سما (بظاہر اس سے بلندی آسمان اور اس کی فضا مراد ہے) آفتاب، چاند، ستارے، افلاک، (حرکت کرنے والے آسمان) رات، دن، گرمی، سردی، ہوائیں، عناصرِ اربعہ (مٹی، پانی، ہوا، آگ) بارش، بڑے بڑے پتھر، پہاڑ، چھوٹے پتھر، کیچڑ، معدنیات، نباتات، درخت خرمہ، اور عام درختوں کا ذکر کرتا ہوں اور یہ کہ ان میں کیا کیا دلیلیں اور عبرتیں ہیں۔

آسمان کے بارے میں:

سماء (بلندی وفضائے آسمان) کے رنگ کو دیکھو! کہ اس میں کیا بہترین تدبیر ہے؟ کیونکہ یہ رنگ نظر کے لیے تمام رنگوں کی بہ نسبت زیادہ مناسب اور مقوی ہے۔ یہاں تک کہ اطباء بھی اس شخص کے لیے جس کی آنکھ میں کوئی بیماری ہوگئی ہو سبزی کی طرف برابر دیکھنا یا جو قریب قریب مائل نہ سیاہی ہو تجویز کرتے ہیں اور حذاق اطباء اس کے لیے جس کی نظر کمزور ہوگئی ہو ایسے لگن میں دیکھا کرنا بتاتے ہیں جس کا رنگ سبز ہو اور اس میں پانی بھرا ہوا ہو۔

تو دیکھو! کہ اللہ جل جلالہٗ وتعالیٰ نے آسمان (۱) سبز رنگ کا کیونکر بنایا ہے جو مائل بہ سیاہی ہے، تا کہ ان نگاہوں کو روکے جو اس پر بار بار پڑتی ہیں اور دیر تک دیکھنے سے ان میں خرابی (یا کوئی خراش) نہ ڈالے۔ پس یہی ایک چیز جس کو لوگوں نے فکر وغور اور تجربوں سے حاصل کیا ہے۔ (یعنی یہ کہ آشوب چشم والے کو سبز رنگ کی طرف دیکھنا چاہیے) وہ خدائی حکمت بالغہ کے ذریعے سے اس کی خلقت میں منزوع عنہ (یعنی مخالفِ خلقتِ مخلوق نہیں) پائی جاتی ہے۔ جن میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوئی، بلکہ پہلے ہی سے انسان وغیرہ کی ضرورت کے لیے مہیا کر دیا ہے۔ تا کہ عبرت حاصل کرنے والے اس سے عبرت حاصل کریں اور ملحدین اس میں غور کریں، اللہ ان کو قتل کرے کہاں بہکے چلے جا رہے ہیں۔

(قاتل هم الله ان يؤفكون)

مفضل! رات اور دن کے قائم کرنے کے لیے آفتاب کے طلوع اور غروب کرنے کی بابت غور کرو۔

(۱) حدیث میں لفظ سماء ہے جس سے میں فضائے آسمان اور اس کی بلندی سمجھتا ہوں کیونکہ مقابلہ میں اس کے معصوم نے فلک فرمایا ہے جس سے خاص گردش کرنے والا آسمان مراد ہے۔

پس اگر اس کا طلوع نہ ہوتا تو تمام عالم کا کام بھی تباہ و برباد ہو جاتا، نہ تو لوگ اپنے معاش کی کوشش کر سکتے تھے اور نہ اپنے دوسرے کام کر سکتے تھے، جب کہ تمام دنیا ان کی نگاہ میں تیرہ تاریک ہوتی اور روشنی کی لذت اور راحت نہ پانے کی وجہ سے ان کی زندگی بھی بامزہ اور خوشگوار نہ ہوتی۔

اس کے طلوع کے اغراض تو خیر اس قدر واضح ہیں کہ اس کے بیان میں طول دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے غروب کے فوائد پر غور کرو۔

پس اگر وہ غروب نہ ہوتا، تو آدمیوں کو آرام وقرار ہی نہ ملتا، باوجود اس کے ان کو اپنے بدن کو راحت پہنچانے اور اپنے حواس کو مجتمع کرنے اور ہضم طعام کے لیے قوت ہاضمہ کو ابھارنے اور غذا کو اعضاء کے اندر اثر ونفوذ کرانے کے لیے بڑی سخت ضرورت سکون وآرام لینے کی ہے۔

پھر (اگر غروب آفتاب نہ ہوتا اور رات نہ آتی برابر دن ہی رہتا تو) ان کا حرص ان سے برابر اقدر کام لیتا کہ جس سے ان کے جسم میں سخت خرابی پیدا ہوتی، کیونکہ اکثر آدمی اس قسم کے ہیں کہ اگر یہ رات ان پر اپنی تاریکی نہ ڈالے تو کسب معاش اور جمع مال اور خزانہ کرنے کی حرص کی وجہ سے بالکل آرام وقرار ہی نہ لیں۔

پھر یہ بھی ہوتا کہ برابر آفتاب کے روشن رہنے کی وجہ سے تمام زمین تپتی رہتی اور جو حیوانات یا نباتات کہ اس پر ہیں وہ بھی ہر وقت جلتے رہتے (اور اس سبب سے تمام حیوانات ونباتات کو سخت نقصان پہنچتا) لہذا اس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اپنی حکمت و تدبیر سے یہ مقدر کر دیا کہ ایک وقت غروب کرے اور ایک وقت طلوع کرے، جیسے چراغ مکان والوں کے لیے ایک وقت میں ضرورتوں کے رفع کرنے کے لیے روشن کر دیا جاتا ہے اور اسی طرح پھر ان سے غائب ہو جاتا (یعنی بجھا دیا جاتا ہے) تا کہ انہیں سکون وقرار

ملے۔ تو باوجود یکہ نور اور ظلمت دونوں آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پھر بھی ان امور کے لیے جن میں اصلاح ودرستی عالم ہے کس قدر مطیع ومعین ہیں۔ (اس میں مانویہ فرقہ کی رد ہے، جو کہتا ہے کہ تاریکی محض شر ہے اس میں کوئی خیر وخوبی نہیں، حالانکہ ظلمت یعنی تاریکی میں اتنے فوائد ہیں جو اوپر بیان فرمائے گئے ہیں۔)

پھر سال کے چاروں زمانوں (گرمی، سردی، ربیع اور خریف) کے قائم کرنے کے لیے آفتاب کے بلند ہونے اور نیچے کی طرف جھکنے پر غور کرو، کہ اس میں کیا تدبیر و مصلحت ہے؟ (آفتاب کے بلند ہونے سے مطلب اس کا خط استواء سے جانب شمال آنا اور انحطاط سے مطلب جانب جنوب چلا جانا ہے، جو نظام بطلیموسی سے اور نیز ارصادات کواکب سے ثابت ہے کہ آفتاب کی براہ مدارات یومیہ جانب جنوب وشمال حرکت ہوتی رہتی ہے، اسی سے اعتدال ربیعی، اعتدال خریفی، انقلاب صیفی اور انقلاب شتوی پیدا ہوتے ہیں (یعنی سردی وگرمی پیدا ہوتی ہے)

جس زمانے میں اس کا رجحان جانب شمال ہوتا ہے تو شمالی ملکوں میں گرمی ہوتی ہے اور جب جانب جنوب چلا جاتا ہے تو شمالی حصوں میں سردی ہوتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس اس کے برعکس جنوبی ملکوں میں ہے۔ انہیں دو زمانوں کے درمیان رفتارِ آفتاب میں فصل ربیع وفصل خریف ہوتی ہے۔

جاڑے میں درخت اور دیگر نباتات میں حرکت عود کر آتی ہے اور ان میں پھلوں کے مادے پیدا ہو جاتے ہیں اور حرارت اسکے اندر ہی جمع رہتی ہے، یہی وہ اصلی حرارت اس کی ہوتی ہے جو پھلوں کے مادوں کو تیار کرتی ہے، اگر سردی سے حرارت کا جمع ہونا مثال سے سمجھنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ اس زمانے میں کنوؤں کا پانی گرم ہوتا ہے اس لیے کہ زمین کی حرارت باہر نہیں نکل سکتی، اس کے مسامات بند ہو جاتے ہیں۔

برخلاف اس کے گرمیوں میں کنوؤں کا پانی ٹھنڈا ہو جاتا ہے، اس لیے کہ حرارت بہ سبب مسامات کے کھلے رہنے کے نکلتی رہتی ہے، اور ہوا میں کثافت پیدا ہوتی ہو جاتی ہے جس سے ابر اور بارش پیدا ہوتے ہیں، اسی فصل میں حیوانات کے بدن قوی اور مضبوط ہوتے ہیں۔

فصل ربیع میں بھی حرارت (طبیعی) حرکت میں آتی ہے اور اس مادے کا ظہور ہوتا ہے جو سردی کے موسم میں پیدا ہوا ہے، اس سے نباتات میں خوشے لگتے ہیں، درختوں میں پھل آتے ہیں، حیوانات کو ہیجان شہوت ہوتا ہے۔

گرمی میں ہوا گرم ہو جاتی ہے جس سے پھل پختہ ہوتے ہیں اور جسم کے رطوبات فضلیہ تحلیل ہوتے ہیں، زمین خشک ہو کر عمارت بنانے اور نیز دوسرے کاموں کے قابل ہو جاتی ہے۔

لہذا خریف کے زمانے میں ہوا صاف ہو جاتی ہے۔ امراض دفع ہو جاتے ہیں، بدن صحیح ہو جاتے ہیں اور رات طولانی ہو جاتی ہے، تو اس میں بعض بعض کام (اطمینان کے ساتھ) اس کے طولانی ہونے کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔

اس فصل میں اور مصلحتوں کے لیے بھی ہوا بہت اچھی ہوتی ہے، اگر میں ان سب کا ذکر کروں تو طول کلام ہو جائے گا۔

اب سال کا دور قائم کرنے لے لیے آفتاب کے بارہ برجوں میں منتقل ہوتے رہنے پر غور کرو، اور دیکھو کہ اس میں کیا حکمت ہے؟

یہ وہی دور ہے جس سے سال کے چاروں زمانے، جاڑا، ربیع، گرمی اور خریف درست ہوتے ہیں اور یہی دور ان چاروں زمانوں کو پورا کرتا ہے۔ آفتاب کے اس قدر دورے اور گردش میں غلے اور پھل تیار ہوتے ہیں اور انسان کی غرض و غایت تک پہنچ جاتے

ہیں۔ پھر دوبارہ عود کرتے اور نشو نما شروع کرتے ہیں۔

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ برج حمل سے برج حمل تک آفتاب کے سیر کی مقدار کا نام سال ہے۔ پس سال اور ایسی ہی چیزوں (مہینوں اور ہفتوں وغیرہ) سے زمانے کا شمار و پیمانہ اس وقت سے ہے جب سے خدائے تعالیٰ نے عالم کو پیدا کیا ہے۔ گزشتہ ہر زمانے اور ہر عصر میں بھی یہی ہوتا رہا ہے۔ اس سے لوگ عمروں اور قرض و اجارہ اور دیگر معاملات وغیرہ کاموں کی معین مدتوں کا حساب لگاتے ہیں۔ دور آفتاب ہی کی رفتار سے سال پورا ہوتا اور زمانے کا حساب صحت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

دیکھو کہ آفتاب کس طرح عالم پر اپنی روشنی ڈالتا ہے اور کس حکمت سے ایسا ہونا اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس گر آسمان کے صرف ایک مقام پر آفتاب روشن رہتا، وہیں ٹھہرا رہتا، وہاں سے حرکت نہ کرتا، تو اس کی شعاعوں اور اس کا فائدہ اکثر سمتوں میں نہ پہنچتا، اس لیے کہ پہاڑ اور دیواریں اس سے مانع ہوتیں۔ لہذا ایسا بنایا گیا کہ دن کے پہلے حصے میں مشرق سے طلوع کرے اور اپنے سامنے والی مغرب کی تمام چیزوں پر روشنی ڈال۔ پھر برابر گردش کرتا رہے اور ایک سمت کے بعد دوسری پر پھیلتا رہے۔ یہاں تک کہ جب مغرب میں پہنچ جائے تو ان تمام چیزوں پر روشنی ڈالے جن پر اس کی تابش دن کے اول حصے میں نہیں پہنچی ہے، تاکہ کوئی ایسا مقام باقی نہ رہ جائے جو فائدے کا ایک حصہ اور وہ غرض نہ حاصل کرے۔ جس کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ (یعنی اس قسم کی گردش آفتاب بنائی گئی ہے) اور اگر ایک سال تک یا سال کے کچھ ہی حصے میں اس کے برخلاف ہو جائے تو بتاؤ بھلا آدمیوں کا کیا حال ہو۔ بلکہ اس صورت میں وہ زندہ ہی کیونکر رہیں۔ کیا انسان ایسی بڑی بڑی باتوں کو دیکھتا نہیں جن میں اس کی کوئی تدبیر نہ چل سکتی تھی وہ خود اپنے قانون و قواعد پر جاری ہو گئے نہ سستی کرتے ہیں اور نہ اپنی اوقات معینہ سے جو نظام و بقائے عالم کے لیے

ضروری ہے پیچھے رہ جاتے (بلکہ جس طرح کی ضرورت نظام عالم کے قائم رکھنے کے لیے
پڑتی ہے اس کو وہ باقاعدہ جاری کی ہوئی چیزیں انجام دیتی رہتی ہیں جیسے یہی حرکت آفتاب
ہے کہ اس سے کس طرح باقاعدہ نظام عالم قائم ہے۔) کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ خود بخود یہ
انتظام ہو گیا ہو، کیا آفتاب کے مادے یا صورت میں یہ ادراک ہے جو ایسا کرے؟ کیا
آفتاب کو زمین کی چیزوں سے کوئی رشتہ ہے جو اسے نباتات وحیوانات کے فائدہ رسانی کے
لیے آمادہ کرتا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ بلکہ کسی اور مدبر نے جس نے زمین کی چیزوں کو پیدا
کیا ہے اور جن کی مصلحت آفتاب کی حرکت اور اس کی روشنی کے اثر پر قرار دی ہے اسی نے
اس آفتاب کو بھی پیدا کیا اور اس کو باقاعدہ گردش کرنے والا بنایا کہ نظام اشیائے نباتی وحیوانی
و جمادی قائم رہے۔

"فتبارک اللہ احسن الخالقین"

چاند کے بارے میں:۔

اللہ تعالیٰ نے چاند کے ذریعے سے (بڑا) ثبوت پیش کیا ہے۔ اس میں ایک
بڑی رہنمائی ہے عام خلائق اس کو مہینے کے شمار میں استعمال کرتے ہیں، اس کے مطابق
سال کا حساب درست نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا دورہ نہ تو چاروں فصلوں کو پورا کرتا ہے نہ
پھلوں کے پیدا ہونے اور ان کی پختگی کو (پورا کرتا ہے) اسی وجہ سے قمری مہینے اور سال،
شمسی مہینوں اور سال سے مختلف ہوتے ہیں۔ چونکہ قمری مہینے بدلتے رہتے ہیں، تو کبھی وہی
ایک مہینہ گرمی میں واقع ہوتا ہے اور کبھی سردی میں (مثلاً کبھی، رجب کا مہینہ جو قمری حساب
سے ہے، جنوری میں واقع ہوتا ہے جو شمسی مہینہ ہے اور کبھی مارچ میں، علیٰ ہذا القیاس اور
مہینوں کا حال ہے۔ یا مثلاً محرم ہی ہے کہ کبھی گرمیوں میں واقع ہوتا ہے، کبھی برسات میں
کبھی جاڑوں میں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمری اور شمسی مہینے بدلتے رہتے ہیں ایک

دوسرے کے مطابق اور حساب میں برابر نہیں ہیں۔)

اس بات پر غور کرو کہ یہ (چاند) شب کے وقت کیوں روشن ہوتا ہے اور اس میں
کیا حکمت کیا ہے؟

جانداروں کے سکون وقرار اور نباتات کو برودت پہنچانے کے لیے تاریکی کی
ضرورت ہے پھر بھی اس میں (کوئی) خوبی نہ تھی کہ رات بالکل ہی گھپ اندھیری ہو، روشنی
بالکل نہ ہو کہ کوئی کام بھی اس میں ممکن نہ ہو۔ اس لیے کہ اکثر رات کے وقت بھی آدمیوں کو
کام کرنے کی اس وجہ سے ضرورت ہوتی ہے کہ بعض کاموں کے لیے دن کا وقت تنگ ہوتا
ہے یا گرمی کی شدت وافراط کے سبب سے (دن کو آدمی کام نہیں کر سکتا) تو وہ چاند کی روشنی
میں بھی کام کرتا ہے۔ جیسے زراعت، دودھ دوہنا، لکڑی کاٹنا وغیرہ وغیرہ۔ لہذا چاند کی روشنی
اس لیے بنائی گئی ہے کہ آدمیوں کے کسب معاش میں معین و مددگار ہو جب کبھی اس کی
ضرورت پڑے اور راہ گیروں کو چلنے میں دلچسپی رہے اور اس کا طلوع رات کے کسی کسی حصے
قرار دیا گیا۔ (نہ برابر تمام رات میں) اور آفتاب کی روشنی سے اس کی روشنی کم رکھی گئی۔ اس
لیے کہ لوگ اسی طرح کام نہ کرنے لگیں۔ جیسے دن میں کام کرتے ہیں اور آرام ہی نہ لیں۔
تو پھر بیمار ہو کر مر ہی جائیں، (یعنی اگر چاند کی روشنی تمام رات قائم رہا کرتی اور اس کی
تیزی، بھی آفتاب کے مثل ہوتی تو حریص آدمی شب کے وقت آرام نہ کرتے بلکہ اسی طرح
کام کاج میں مصروف رہتے جیسے دن کو مصروف کار رہتے ہیں۔)

پس چونکہ ایسا ہونا نظام عالم لے لیے مفید نہ تھا، اس لیے اس کی روشنی مدھم بنائی
گئی اور ایسا مقرر ہوا کہ تمام رات نہ روشن رہا کرے، تاکہ انتظام عالم میں خلل نہ پڑے۔

چاند کے تغیرات میں جو رویت ہلال کے وقت، نیز گھٹنے بڑھنے اور گہن لگنے سے
ہوتے ہیں خاص کر اس امر کی تنبیہ ہے کہ کسی باقدرت خالق نے یہ تغیرات اس میں صلاح

عالم کے واسطے مقرر کیے ہیں جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ (یعنی غور کرنے والے ان تغیرات سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آخر چاند میں کمی زیادتی، گہن وغیرہ کیوں رونما ہوتے ہیں۔ اس میں بھی کسی خاص مدبر کی حکمت ہے جس نے نظام عالم کے واسطے ایسا کیا ہے۔)

ستاروں کے بارے میں:۔

مفضل! (ذرا) ستاروں اور ان کے اختلافِ رفتار پر غور کرو۔ بعض تو ایسے ہیں جو اپنے مرکز ومقام سے جو آسمان میں ان کے لیے مقرر ہے جدا ہوتے ہی نہیں اور اگر ان کو گردش ہوتی ہے تو ایک ساتھ ہی ہوتی ہے (جیسے ثوابت ستارے جو اپنے اپنے مرکزوں پر قائم ہیں اور گردش فلکی کی وجہ سے اجتماعی طور پر وہ گردش کرتے معلوم ہوتے ہیں مگر خود وہ اپنے مرکز اصلی کو نہیں چھوڑتے) اور بعض اس سے چھوٹے ہوئے ہیں، (یعنی وہ متحرک ہوتے ہیں) کہ برجوں میں آتے جاتے رہتے اور رفتار میں بھی مختلف ہیں، (مثلاً کسی کا دورہ بارہ مہینے کا ہے، کسی کا صرف ایک مہینے کا، کسی کا اٹھارہ مہینے کا اور علی ہذاالقیاس) اور ان میں سے ہر ایک کے لیے دو مختلف رفتاریں ہیں، ایک تو عام ہے جو فلک الافلاک کی گردش کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف ہوتی ہے، (جو روزانہ کے طلوع وغروب سے معلوم ہو سکتی ہے) دوسرے خود اس کی ذاتی رفتار ہے جو مشرق کی طرف ہوتی ہے جیسے وہ چیونٹی جو چکی کے پاٹ پر پھرتی ہو، چکی تو دائیں جانب سے گردش کرتی ہے اور چیونٹی بائیں جانب سے، اس صورت میں چیونٹی کو دو قسم کی مختلف حرکتیں ہوں گی، ایک اس کی ذاتی رفتار ہے جو اپنے سامنے کی طرف ہوگی، دوسری بلا ارادہ چکی کے ساتھ ساتھ جو اسے پیچھے کی طرف کھینچتی ہو گی، (یہ مسئلہ علم ہیئت نے مسائل میں سے نہایت ہی لطیف ہے اور مثال بھی بے نظیر ہے فلسفہ ہیئت کے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ سیارات اپنی اصلی حرکت سے مشرق کی طرف

حرکت کرتے ہیں۔ یہ بات چاند کی حرکت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے کہ پہلی شب میں کہاں طلوع کرتا ہے، اور دوسری شب میں اس سے کس قدر مشرق کی طرف، پھر تیسری شب میں دوسری شب سے زیادہ مشرق کی طرف، یہاں تک کہ بارہ تیرہ تاریخ کو ٹھیک مشرق سے طلوع کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔)

یہی حال آفتاب کا بھی ہے کہ مغرب سے مشرق کی طرف آتا ہے، علی ہذاالقیاس دوسرے سیارات، زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل کی بھی ذاتی حرکت یہی ہے، مگر چونکہ فلک الافلاک کی گردش مشرق سے مغرب کی طرف ہے جیسا کہ صرف بارہ گھنٹوں کے ایک دن میں، یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ آفتاب کہاں سے نکلا اور کہاں چلا گیا۔ تو یہ تمام سیارات اپنی اصلی حرکت کے ساتھ ساتھ فلک الافلاک کی گردش کے بھی تابع ہیں۔ خود تو آہستہ آہستہ اپنی ذاتی حرکت مغرب کی طرف سے مشرق کو آتے ہی ہیں، مگر قسری (غیر ذاتی) حرکت سے مشرق کی طرف سے مغرب کو چلے جاتے ہیں، لہذا چیونٹی کی مثال بالکل ٹھیک ہوگئی، جو چکی کی حرکت کے برخلاف چل رہی ہو، وہ اپنی حرکت سے ضرور بائیں طرف چلی جاتی ہے گو چکی اسے دائیں جانب لیے جاتی ہے مگر وہ چکی کے پورے حلقے کو اپنی حرکت سے بائیں رخ پر پورا کر ہی دے گی)

اب ان لوگوں سے دریافت کرو جو اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ستارے جس حالت وکیفیت پر اب ہیں اسی طرح بغیر خالق وصانع کے بن گئے ہیں کسی نے بالارادہ ان کو نہیں بنایا ہے کہ آخر کس چیز نے روک دیا تھا کہ تمام ستارے ثوابت ہی نہ ہوں یا سب کے سب سیارے نہ ہوں گے۔ (ایسا کیوں ہوا کہ کچھ تو غیر متحرک ہوئے اور کچھ متحرک، اس کا سبب کیا ہے؟) تو یہ دو مختلف حرکتیں خاص انداز ومقدار پر کیوں ہوتی ہیں (کمی زیادتی کیوں نہیں ہوتی، ایک ہی رفتار سب کی کیوں نہیں ہے وغیرہ وغیرہ)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں قسموں کے ستارے کی اس طور پر گردش
جواب ہے کسی ارادے، تدبیر، حکمت اور تقدیر (اندازہ) سے ہوئی ہے مہمل یعنی بغیر خالق
کے نہیں ہے جیسا کہ ان معطلین (دہریوں) کا دعویٰ ہے۔

اب اگر کوئی معترض یہ کہے کہ "پھر بعض ستارے ثوابت کیوں ہوئے اور بعض
سیار کیوں ہیں؟

تو ہم اس کو یہ جواب دیں گے کہ اگر سب کے سب ثوابت ہوتے تو وہ شناختیں
اور دلالتیں نہ رہ جاتیں جو ان سیارات کے ایک برج سے دوسرے برج میں جانے اور منتقل
ہوتے رہنے سے معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ عالم کی بہت سی اشیاء حادثہ آفتاب اور باقی
ستاروں کے اپنے اپنے منازل میں منتقل ہوتے رہنے سے معلوم ہوتے ہیں۔ (جیسا کہ
منجمین نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے)۔ (لہذا وہ فائدے جو اب صرف ستاروں کے
متحرک ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً فصلوں کا معلوم کرنا، حوادث کا پتہ لگانا، وغیرہ
وغیرہ وہ فوت ہو جاتے) اور اگر سب کے سب سیار اور متحرک ہوتے تو ان کی معروف منزل
اور کوئی علامت نہ ہوتی، کیونکہ اگر واقفیت ہوتی ہے تو اسی سے کہ کواکب سیارہ اپنے اپنے
معین برجوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں، جیسا کہ کسی راہ چلنے والے کی رفتار کا اندازہ
منزلوں سے ہوتا ہے (کہ ایک منزل چلا ہے یا دو منزل یا چار منزل۔ اگر میل، کوس یا منزلیں
نہ بنی ہوتیں تو ان کی رفتار کا انداز نہایت دشوار تھا۔

علی ہذا القیاس، اگر یہ ستارے سب متحرک ہوتے اور ان کی حرکتیں بھی مختلف
ہوتیں، تو ان کی رفتار کا اندازہ ناممکن ہوتا، اول تو اس وجہ سے کہ یہ لاکھوں ہی ہیں، کہاں تک
کوئی محاسب یا منجم ان کا حساب لگا سکتا تھا؟ دوسرے اس وجہ سے کہ کوئی مشرق میں ہے کوئی
مغرب میں، کوئی شمال میں ہے تو کوئی وسط میں، کوئی انتہا میں ہے، کوئی ابتداء میں، لہذا ان

کے منازل مقرر کرنا بھی ناممکن ہو جاتا۔

تیسرے اس وجہ سے کہ ان سب کا بارہ بروج مشہورہ میں سے ہو کر جانا ہی محال
ہے لہذا اندازہ بھی ناممکن ہوتا، تو غرض اصلی جو ان کے موجود ہونے اور حرکت کرنے سے
ہے سب لغو اور مہمل ہو جاتی۔)

اور اگر سب کے سب ایک ہی حالت پر حرکت کرتے ہوتے تو ان کا نظام ایک
دوسرے سے مخلوط ہو کر وہ اغراض جو ان میں قرار دی گئی ہیں فوت ہو جائیں۔

اور پھر کسی کہنے والے کو یہ بھی حق حاصل ہوتا کہ وہ، یہ کہہ سکتا، ان کا ایک ہی
حالت پر حرکت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا کوئی مدبر و خالق نہیں ہے۔ جس طرح ہم
(اس اختلافِ رفتار سے) اس کا وجود ثابت کر آئے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ ان کے
اختلاف رفتار و تغیرات اور ان کی حرکتوں کے اغراض و مصلحت میں کھلی ہوئی دلیل اس بات
کی ہے کہ ان میں تدبیر و ارادہ سے کام لیا گیا ہے، (کسی مدبر خالق نے ان کو باقاعدہ حرکت
دی ہے اور اختلاف حرکت قائم کیا ہے تاکہ لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔)

ان ستاروں کی بابت غور کرو جو سال کے کسی حصے میں ظاہر ہوتے ہیں اور کسی
سال چھپ جاتے ہیں، جیسے ثریا، جوزا، دونوں ستارہائے شعری اور سہیل، اگر یہ تمام
ستارے ایک وقت میں ظاہر ہوا کرتے تو ان میں سے کوئی ایسی نشانی نہ بن سکتا جسے لوگ
پہچانتے اور جانتے اور اپنے امور میں اس سے ہدایت پاتے۔ جیسے کہ ان ثور و جوزا وغیرہ
کے طلوع و غروب سے (واقعات وغیرہ) کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

لہذا ہر ایک کا طلوع و غروب خاص خاص موقعوں میں اس لیے قرار پایا کہ لوگ
ان باتوں سے فائدہ اٹھائیں جنہیں یہ ستارے علیحدہ علیحدہ بناتے ہیں اور جیسا کہ ثریا وغیرہ
خاص خاص مصلحتوں کے لیے کسی وقت طلوع کرتے اور کسی وقت غروب ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح بنات النعش ایسے بنائے گئے ہیں کہ ہمیشہ ظاہر ہی رہیں کبھی غروب ہی نہ ہوں کیوں کہ اس کی خاص غرض ہے۔ وہ یہ کہ یہ ستارے بمنزلہ ایک نشان کے ہیں جن سے لوگ جنگل اور دریا میں نا معلوم راہوں کو معلوم کر لیتے ہیں۔ چونکہ یہ ستارے کبھی غروب نہیں ہوتے اس لئے جب انسانوں کو کوئی راہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو فوراً ان کی مدد سے راہ معلوم کر لیتے ہیں۔

یہ دونوں باتیں باوجود اپنے اختلاف حالات کے غرض اور مصلحت ہی میں صرف کی گئی ہیں، (کوئی ان میں سے بے کار یا نقصان دہ نہیں ہے۔)

(علاوہ بریں) اس میں بہت سے کاموں کے اوقات کی شناخت دلالت ہے مثلاً، زراعت باغبانی، خشکی یا دریا کا سفر اور دیگر چیزوں کی بھی شناخت ہوتی ہے جو مختلف زمانوں میں ہوتے رہتے ہیں مثلاً، بارش کا برسنا، ہواؤں کا چلنا، گرمی کا ہونا اور جاڑوں کا آنا۔

نیز اندھیری راتوں میں چلنے والے، وحشت ناک میدانوں اور خوفناک دریاؤں میں ان سے راہ پاتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ ستارے جو آسمان پر کبھی آگے کو چلتے ہیں تو کبھی پیچھے کو ہٹتے ہیں، کبھی مغرب کی طرف جاتے ہیں اور کبھی مشرق کی جانب اس میں بھی بہت سی عبرتیں ہیں۔

چونکہ چاند اور سورج دونوں کواکب نہایت تیز رفتاری سے چلتے ہیں تو اگر ہم سے قریب ہوتے اور ہمیں ان کی سرعت رفتاری کا صحیح اندازہ ہوتا تو کیا تمہارا خیال ہے کہ اس ضیاء اور شعاع سے لوگوں کی آنکھیں خراب نہ ہو جاتیں جیسے بعض اوقات بجلی کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں جب کہ وہ کبھی چمکتی ہے، اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ اگر چند آدمی ایسے مکان میں ہوں جس کی چھت میں بہت سی قندیلیں نہایت روشن ہوں اور بہت تیز رفتاری سے ان کے سروں کے گرد گردش کر رہی ہوں تو ضرور ان کی آنکھیں پتھرا کر خیرہ

تار ہو جائیں گی اور یہ لوگ چکر کھا کر گر پڑیں گے۔ (پس اگر اس سرعت رفتاری کے ساتھ ستارے ہمارے سر کے قریب ہوتے اور تیزی سے ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرتے ہوئے چلتے تو کسی طرح بھی ان پر نظر نہ ٹھہر سکتی اور لوگ گھبرا گھبرا کر گر پڑتے۔)

تو دیکھو! کہ کس طرح یہ بات مقرر کر دی گئی ہے کہ ان کی رفتار ہم سے بہت فاصلے پر ہو، تاکہ نگاہوں کو نقصان نہ پہنچے اور کوئی بیماری پیدا نہ ہو اور اس قدر تیز رفتار اس لیے بنائے گئے کہ جس قدر ان کی سیر و رفتار کی ضرورت ہے اس میں بھی خلل واقع نہ ہو۔

ان ستاروں میں تھوڑی روشنی دی گئی، تاکہ چاند نہ ہو تو یہ اس کی جگہ پر روشنی کا کام دیں اور جب چلنے پھرنے کی ضرورت ہو تو اندھیری رات کے گھپ اندھیرے سے گھبرا نہ جائیں اور ان کی ضو میں چلنا پھرنا ممکن اور آسان ہو سکے، چنانچہ آدمی کو کبھی اس بات کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ وہ شب میں چلے پھرے، اگر کچھ بھی روشن نہ ہوتا جس سے وہ راہ تلاش کرے تو اس کو اپنے مقام سے حرکت بھی دشوار ہو جاتی۔

اس لطف و حکمت پر غور کرو جو اس قسم کی خلقت و تقدیر (ایک خاص اندازہ پر کسی چیز کو بنانا) میں قائم کی گئی ہے۔ تاریکی کی بھی مدت قرار دی گئی ہے کیونکہ اس کی ضرورت تھی اور اس کے اندر یہ ضو بھی قرار دی گئی جس سے وہ اغراض پورے ہوں جنہیں ہم نے بیان کیا۔

اس فلک پر مع اس کے آفتاب و ماہتاب، ستاروں اور برجوں کے غور کرو جو ایک خاص اندازہ اور مقدار کے ساتھ جہان کے گرد اپنی اس دائمی گردش سے پھرتے رہتے ہیں یہ اس لیے کہ رات، دن اور ان چاروں فصلوں کے اختلاف میں خود زمین اور زمین کے رہنے والے مختلف حیوانات اور نباتات کے لیے بہت سی مصلحتیں ہیں۔

کیا کوئی صاحب عقل و فہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی بہترین تدبیر و اصلاح جس سے نظام عالم میں درستی و حکمت قائم رہے بغیر کسی مقتدر حکیم کے ہو گئی ہے۔

پس اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ بخت واتفاق سے ایسا ہو گیا ہے۔ (کسی خالق کی حکمت وتدبیر اس میں نہیں ہے) تو یہی بات وہ اس دولاب (چرخ یا رہٹ، جس سے پانی کنوئیں سے کھینچ کھینچ کر باغوں وغیرہ میں پہنچایا جاتا ہے) کی بابت بھی کیوں نہیں کہتا جسے وہ پھرتے ہوئے اور کسی ایسے باغ کو سینچتے ہوئے جس میں درخت اور نباتات لگے ہوئے ہیں دیکھتا ہے (اس میں بھی یہی کہہ دینا چاہیے کہ یہ رہٹ تو خود بخود ہی چلتا ہے، خود بخود بن گیا ہے اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے) کیونکہ اس کے بھی تمام آلات کو وہ دیکھتا ہے کہ معین اندازے سے بنائے گئے ہیں اور ایک جزو دوسرے جزو سے اسی قاعدے پر ملا ہوا ہے جس میں اس باغ کی اور اس کے اندر کی چیزوں کی بہتری ہے اور اگر وہ یہی بات اس دولاب کی بابت بھی کہے (کہ یہ خود بخود ہی بن گیا ہے) تو کیونکر اس کے لیے یہ ثابت کیا جائے گا کہ اس کا کوئی بنانے والا ہے۔ اور تمہارے نزدیک لوگ ایسے کہنے والے کو کیا کہیں گے؟ یہی کہیں گے کہ اے احمق بدمغزے، بیوقوف، خردماغ، دیکھتا نہیں کہ رہٹ کی طبیعت اور اس کا مادہ جو خود بے عقل و بے ادراک چیز ہے کیا ایسا کر سکتا ہے کہ اس اندازے اور ترتیب کے ساتھ باغ کی تمام مناسبتوں کے لحاظ سے ایسا رہٹ بنا دے؟ کیا کوئی عقل اسے تسلیم کرے گی؟

کیا ایک لکڑی بنے ہوئے دولاب میں جو تھوڑی سی تدبیر وحکمت سے صرف ایک قطعہ زمین کے فائدے کے لیے بنایا گیا ہے اس بات کے کہنے سے انکار کرے گا اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ کسی نے اسے باندازہ وحکمت نہیں بنایا ہے اور اتنے بڑے دولاب (چرخ آسمان) کی نسبت جو ایسی ایسی حکمتوں کے ساتھ بنا ہو جس کے سمجھنے سے انسانی ذہن عاجز ہے اور جس میں تمام روئے زمین اور اس پر کل چیزوں کا فائدہ ہے، کہہ سکے گا کہ یہ ایک اتفاقی چیز ہے۔ بخت واتفاق سے بے صناعی اور بے تقدیر و اندازہ بن گیا ہے، اگر آسمان کی کوئی کل ویسے ہی بگڑ جائے جیسے لکڑی کے بنے ہوئے آلات بگڑ جاتے

ہیں تو انسانوں کے پاس کوئی ایسی تدبیر ہے جس سے اس کو ٹھیک کر سکیں؟

(توبہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ، خیال تک بھی نہیں ہو سکتا تدبیر کیسی۔ یہ تو دہریوں کی صرف ہٹ دھرمی ہے جو ایسا کہتے ہیں ورنہ بھلا کہیں عقل بھی ایسی احمقانہ بات کہنے کی رائے دے سکتی ہے۔)

دن اور رات کے بارے میں:

مفضل! ذرا رات اور دن کی مقدار پر غور کرو کہ مخلوقات کی بہتری کے واسطے کس طور پر قائم ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کی حد جب پندرہ گھنٹے تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس سے زیادہ نہیں بڑھتے (حضرت علیہ السلام کا یہ ارشاد معظم بلاد اور معمورات کی نسبت ہے ورنہ عرض ثمانین وتسعین (اسی اور نوے درجے عرض البلد) پر قطب کے قریب قریب تو تقریباً چھ چھ مہینے کے دن اور رات ہوتے ہیں۔)

حضرت علیہ السلام نے صرف ان مقامات کا ذکر فرمایا ہے جہاں آبادی ہے، نہ وہاں کا جہاں کسی جاندار کا رہنا ہی تقریباً محال ہے۔)

کیا تم جانتے ہو کہ اگر دن کی مقدار سو یا دو سو گھنٹوں کی ہو جاتی تو تمام حیوانات و نباتات فنا نہ ہو جاتے۔ (تقریباً مر جاتے اور فنا ہو جاتے) حیوانات تو اس وجہ سے کہ اس طویل مدت میں نہ دم لیتے نہ آرام وقرار ملتا اور بہائم بھی چرنے سے باز نہ آتے (اگر ان کو دن کی اتنی طولانی روشنی ملا کرتی) آدمی بھی کام نہ چھوڑتے اور نہ چلنے پھرنے سے باز آتے۔ لہذا سب کے سب (تھوڑے زمانے میں) ہلاک اور تلف ہو جاتے۔

رہے نباتات، جب ان پر اتنی دیر تک دن کی گرمی اور آفتاب کی تمازت پڑتی تو خشک ہو کر جل جاتے۔

علیٰ ہذا القیاس، رات ہے کہ اگر اسی قدر (سو یا دو سو گھنٹے) بڑھ جاتی تو تمام قسم

کے حیوانات کو چلنے پھرنے اور طلب معاش میں کوشش کرنے سے باز رکھتی، یہاں تک کہ بھوکے ہی مرجاتے، اور نباتات کی تو حرارت طبعیہ (حرارت غریزیہ) ہی فنا ہو جاتی، یہاں تک کہ ان میں نباتات کو دیکھتے ہو جو ایسے مقامات پر ہوتے ہیں جہاں دھوپ نہیں پڑسکتی۔

گرمی اور سردی کے بارے میں:۔

اس گرمی اور سردی پر غور کرو! کہ اپنے کم اور زیادہ اور اعتدال اور سال کی چاروں فصلوں کے قائم کرنے کے لیے کس طور پر تمام عالم میں یکے بعد دیگرے آتی جاتی اور اس قسم سے اپنا عمل کرتی ہیں اور دیکھو کہ ان میں مصلحت کیا ہے۔

پھر یہ بھی کہ اجسام کی اصلاح اور دباغت بھی اسی میں ہے (جس سے بظاہر مراد ہے کہ فصلوں کے بدلنے کے ساتھ جسم کی ہلکی ہلکی جھلیاں بھی اتر کر دوسری جھلی اور نئی کھال پیدا ہوتی ہے۔) جس سے ان کی بقاء ودرستی قائم ہے کیونکہ اگر یہ گرمی اور سردی نہ ہوتی اور اجسام پر یکے بعد دیگرے ان کا توارد نہ ہوتا رہتا تو خراب و فاسد ہو جاتے، ٹوٹ پھوٹ جاتے دبلے اور لاغر ہو جاتے۔

ان دونوں (گرمی اور سردی) کے بتدریج ایک دوسرے میں داخل ہو جانے پر غور کرو! تم دیکھتے ہو گے کہ ان میں سے ایک تو تھوڑی تھوڑی کم اور دوسری تدریجاً بڑھتی ہے، یہاں تک کہ اپنی کمی اور زیادتی کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اگر ایک دوسری پر اچانک و یکبارگی وارد ہوتی (یعنی یکدم گرمی بڑھ جاتی سردی یکدم کم ہو جاتی یا سردی بڑھ جاتی اور گرمی یکدم کم ہو جاتی) تو بدنوں کو اس سے سخت نقصان پہنچتا اور بیمار ہو جاتے جیسے کوئی شخص کسی گرم حمام سے یکبارگی سرد مقام پر چلا آئے تو اسے اس سے نقصان پہنچے گا اور وہ بیمار ہو جائے گا۔

لہذا، خالق عزوجل نے گرمی اور سردی کی یہ تدریج قائم کی تا کہ اس کی مخلوق اس

نقصان سے بچ جائے اور یہ کام تدبیر وحکمت سے خالی نہیں (پس اگر کوئی مدبر وحکیم اس تدبیر وحکمت کا نہ ہوتا تو کون اس بات پر تفکر کرتا کہ گرمی یکبارگی نہ پڑنے لگے یا سردی یکبارگی نہ آجائے کہ اس میں جہان کے اجسام وابدان کا نقصان ہے۔)

اگر کوئی مدعی اس بات کا دعویٰ کرے کہ گرمی اور سردی کی آمد میں یہ تدریج و آہستگی آفتاب کی رفتار سے ہے کہ جس قدر بلند ہوتا رہتا ہے اور نیچے کو جھکتا رہتا ہے اسی قدر دن میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے۔ تو اس سے یہ سوال کیا جائے گا کہ آفتاب کی رفتار اور بتدریج بلندی اور پستی کی طرف آنے کا سبب کیا ہے؟ پھر اگر وہ یہ کہے کہ اس کا سبب مشرق و مغرب کا فاصلہ ہے، تو اس سے یہ سوال کیا جائے گا، کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو یہ سوال اسی طرح ہوتا رہے گا یہاں تک کہ وہ خود بخود ہی قائل ہو جائے گا کہ ضرور اس میں اختیار عمد وتدبیر سے کام لیا گیا ہے (از خود ایسا نہیں ہوا۔)

دیکھو! اگر گرمی نہ ہوتی تو سخت اور کڑوے پھل بھی پختہ ونرم اور شیریں نہ ہوتے جس سے تر اور خشک دونوں حالتوں میں پختگی اور رسیلہ پن حاصل ہو سکتا ہے اور اگر سردی نہ ہوتی تو زراعت میں اس قدر بالیاں نہ نکلتیں اور نہ اس کثرت سے پیداوار ہوتی جو غذا اور تخم پاشی کے لیے کافی ہو سکتی۔

کیا تم دیکھتے نہیں! کہ گرمی اور سردی میں کس قدر فوائد ہیں اور باوجود یہ کہ ان دونوں میں بہت سے فوائد ہیں پھر بھی بدنوں کو ان سے تکلیف ہوتی ہے۔ (حالانکہ یہ تکلیف بھی فائدے سے خالی نہیں) اور اس میں غور کرنے والوں کے لیے عبرت ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تمام کام عالم اور اہل عالم کی بہتری کے لیے کسی حکیم ودانا کی تدبیر سے ہوئے ہیں۔

ہوا کی حکمتیں:۔

مفضل! میں تم کو ہوا اور اس کی حکمتوں سے باخبر کرتا ہوں۔

کیا تم نہیں دیکھتے! کہ جب یہ ٹھہر جاتی ہے تو کیسی بے چینی پیدا ہوتی ہے جو جان لینے کے قریب ہو جاتی ہے تندرست آدمیوں کو بیمار اور مریضوں کو لاغر، پھلوں کو خراب، اشیاء کو متعفن کر دیتی ہے، بدنوں میں وبا اور غلوں میں خرابی پیدا کر دیتی ہے۔ لہذا اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہوا کا چلنا مخلوقات کی بہبودی لے لیے حکیم کی تدبیر سے ہے (نہ کہ از خود)

ہوا کی ایک اور خاصیت تم سے بیان کرتا ہوں۔

آواز، ایک اثر (و کیفیت ہے) جو اجسام کے باہم ہوا میں ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے اور ہوا اس کو کانوں تک پہنچاتی ہے (یہ مسئلہ بھی مسلمات فلاسفہ میں سے ہے کہ جب تک ہوا میں تموج (لہر) پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک آواز نہیں سنائی دیتی) اور انسان اپنی ضروریات اور معاملات کے متعلق دن بھر اور رات کے کچھ حصہ تک گفتگو کرتے رہتے ہیں، تو اگر اس کلام کا اثر ہوا میں باقی رہتا ہے، جیسے تحریر کاغذ پر لکھی جاتی ہے تو تمام عالم اس سے بھر جاتا اور اس سے اہل زمین کو بے چینی پیدا ہوتی، گرانی ہوتی اور ان کو اس بات کی ضرورت ہوتی کہ ہوا بدل جائے اور نئی ہوا آئے (جس میں نئے کلام شروع ہوں۔ کیونکہ پہلی ہوا تو آوازوں سے بھری ہوئی ہے اور کان اس سے مملو ہیں۔ لہذا نئی باتوں کے لیے کسی اور ہوا کی ضرورت ہوتی۔) اور یہ ضرورت اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جو کاغذ کی تبدیلی میں ہوتی ہے، کیونکہ تحریر کی بہ نسبت زبانی باتیں زیادہ کی جاتی ہیں۔ لہذا خلاق حکیم جل قدسہٗ نے ایک ایسا مخفی کاغذ بنایا ہے جو کلام کا اتنی دیر تک حامل رہے جتنی دیر میں اہل عالم کی ضرورت پوری ہو اور اس کے بعد ختم ہو جائے اور وہ ویسی ہی نئی کی نئی، صاف ستھری ہو جائے، اور ہمیشہ ان کلاموں کی متحمل ہوتی رہے جو اس میں واقع ہوتے ہیں۔

تمہارے لیے تو یہی نسیم، جسے ہوا کہتے ہیں اور اس میں جو مصلحتیں ہیں، عبرت حاصل کرنے لے لیے کافی ہے۔ یہ ہوا اجسام و ابدان کی زندگی کا باعث ہے اور بیرونی جانب سے جب ہم اسے سانس کے ذریعے سے جذب کرتے ہیں اور اندرونی جانب سے جب روح سے ملتی ہے تو حیات کو قائم رکھنے والی ہوتی ہے۔ (اگر سانس کے ذریعے سے تازہ ہوا پھیپھڑوں تک نہ جائے اور اندرونی بخارات نہ نکلتے رہیں تو چند لمحوں میں آدمی مر جائے۔) اسی ہوا کے اندر آوازیں واقع ہوتی ہیں جنہیں دور دور تک پہنچا دیتی ہے، یہی ہوا ایک مقام سے دوسرے مقام پر خوشبوؤں کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ دیکھو! جب ہوا چلتی ہے تو تمہاری ناک تک طرح طرح کی خوشبوئیں اڑا اڑا کر لاتی ہے۔ اسی طرح آواز کو بھی ایک جگہ سے دوسرے مقام تک پہنچاتی ہے۔ اور یہی ہوا گرمی و سردی کی بھی حامل ہوتی ہے۔ جو یکے بعد دیگرے بہبودی عالم کے لیے آتی، جاتی رہیں (یعنی سردی اور گرمی اسی ہوا میں قائم رہتی ہیں، اگر عالم میں نہ ہوتیں تو کبھی گرمی اور سردی بھی نہ ہوتیں۔ پڑھو فلسفہ طبعیات، تب تم کو اس کا لطف حاصل ہوگا۔)

اسی سے چلنے والی ہوا بھی پیدا ہوتی ہے، (جس کی حرکت بدنوں کو محسوس ہوتی ہے اور درختوں کو ہلاتی ہے۔) جو اجسام سے فسادات وخرابیوں کو دفع کرتی اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر ابر کو اڑا کر لے جاتی ہے تا کہ اس کا فائدہ عام ہو اور وہ گھرے (دبیر اور تہہ در تہہ) ہوں تا کہ ان سے بارش ہو۔ پھر انہیں منتشر کر کے ہلکا بادل کر دیتی ہے تو منتشر ہو جاتے ہیں۔

درختوں میں پھل پھول پیدا کرتی، کشتیوں کو چلاتی ہے، غذاؤں کو نرم ولطیف بناتی، پانی کو ٹھنڈا کرتی، آگ کو بھڑکاتی اور تر چیزوں کو خشک کرتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زمین کی تمام چیزوں کو قائم و زندہ رکھتی ہے۔ اگر یہ چلنے والی ہوا نہ ہوتو

نباتات خشک (پژمردہ) ہوجائیں، حیوانات مرجائیں اور تمام چیزیں خراب و بے کار ہو جائیں۔

زمین کے بارے میں:۔

مفضل! خدائے تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ان جواہرِ اربعہ (عناصرِ اربعہ) میں فکر کرو، جنہیں اس نے اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ جو ضرورت ان کی ہے وہ بفراغت پوری ہو۔ منجملہ ان کے یہ زمین اور اس کی چوڑائی ہے۔ پس اگر یہ زمین اتنی چوڑی نہ ہوتی تو آدمیوں کے مکانات، زراعتیں، چراگاہیں اور جنگلوں، بنوں، بڑی قدر والی جڑی بوٹیوں اور معدنیات گراں قیمت کے لیے کیونکر کافی ہوتی؟

شاید ایک شخص ان چٹیل میدانوں اور وحشت ناک بیابانوں سے نفرت کرے اور کہے ان میں فائدہ ہی کیا ہے؟

جواب میں (اس سے یہ کہا جائے گا) کہ یہی تو وحشی جانوروں کے رہنے کی جگہ، محل قیام و آرام اور ان کی چراگاہیں ہیں، پھر یہ کہ آدمیوں کے لیے ایک وسیع جگہ حاصل ہے۔ اگر وہ اپنے وطنوں کو تبدیل کرنا چاہیں تو یہاں آکر آباد ہوسکتے ہیں، کتنے ہی بیابان اور میدان تھے جن میں محلات بن گئے اور اگر زمین کی اتنی وسعت نہ ہوتی تو آدمی ایسے ہوتے جیسے کسی تنگ قلعے میں بند کردیے گئے ہیں۔ کیونکہ جب کوئی امر ان کو اس بات پر مجبور کرتا، کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہوں، تو ان کو کوئی چارہ کار نہ ہوتا سوائے اس کے کہ اسی اپنے تنگ وطن ہی کو مجبوراً آباد رکھیں اور وہیں پڑے رہیں۔

پھر یہ غور و فکر کرو زمین جو اس حالت پر پیدا کی گئی ہے جس پر اب ہے، کس طور سے قائم و ساکن پیدا کی گئی ہے کہ تمام چیزوں کے لیے جائے استقرار اور وطن ہوسکے، اسی وجہ سے انسان اپنی ضرورتوں کے لیے اس پر چلنے پھرنے اور اپنے آرام کے لیے بیٹھنے،

راحت پانے، کھیتی بونے اور اپنے کاموں کو استحکام کے ساتھ کرنے پر قادر ہوسکے، ورنہ اگر یہ متحرک یا ادھر ادھر سے جھکی رہتی تو کبھی ان کو ممکن نہ ہوتا کہ اس پر کوئی مضبوط عمارت بنا سکتے، اس پر اپنے دوسرے کام کرسکتے۔ بلکہ ایسی صورت میں جب کہ زمین ہر وقت ہلتی ہی رہتی، ان کی زندگی بھی دوبھر جاتی اور لوگ چلنے پھرنے سے بھی عاری ہوجاتے۔ اسے ان زلزلوں کی طرح سمجھو جو تھوڑی ہی دیر کے لیے رونما ہوتے ہیں۔ پھر جن لوگوں پر ان کا اثر پڑتا ہے وہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ (پس اگر ہر وقت زمین حرکت کیا کرتی تو کس طرح کوئی کام ہوسکتا تھا۔)

اگر کوئی معترض یہ کہے کہ آخر زمین کو زلزلہ کیوں آتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ، زلزلہ اور نیز ایسی ہی دوسری چیزیں (مثلاً سخت آندھی، گہن کا لگنا، بے حد ستاروں کا ٹوٹنا، آسمان پر خوفناک سرخی کا نمودار ہو جانا، وغیرہ وغیرہ) ایک قسم کی نصیحت اور تخویف ہیں۔ تاکہ ان چیزوں سے ڈر کر گناہوں سے باز آئیں۔

علیٰ ہذا القیاس، جو آفتیں اور بلائیں ان کے اجسام اور ابدان اور مال پر وارد ہوتی ہیں، وہ بھی اسی حکمت سے ہیں، کہ ان میں لوگوں کے لیے بہبودی و بہتری اور درستی احوال ہے، اگر وہ (ان چیزوں سے عبرت حاصل کر کے) نیک بن جائیں، گناہوں سے تائب ہو جائیں، تو ثواب و جزا کا ذخیرہ آخرت میں اتنا ملے گا جس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ثواب ان کو دنیا ہی میں فوراً دے دیا جاتا ہے (یعنی خدائے تعالیٰ کے نزدیک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عوام و خواص کی بہبودی اس میں پوشیدہ ہے۔)

پھر یہ زمین بذاتہ بارد و یابس (ٹھنڈی اور خشک ہے) اسی طرح پتھر بھی بارد و یابس ہے (اس میں اور پتھر میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ پتھر میں زمین کی بہ نسبت زیادہ

خشکی ہے۔تو کیا تم جان سکتے ہو کہ اگر تھوڑی سی خشکی اور زمین میں پیدا کردی جاتی تو وہ پتھر ہو جاتی۔تو پھر نباتات کیسے پیدا ہو سکتے تھے کہ جس پر حیوانات وغیرہ کی زندگی کا انحصار ہے، نہ کھیتی ہی کے قابل ہوتی اور نہ عمارت ہی بنائی جاسکتی)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس کی پیوست پتھر کی بہ نسبت کس قدر کم ہے نرمی ورخاوت اس میں قرار دی گئی ہے تاکہ باعتماد ضروری کام سرانجام پاسکیں۔

زمین کی خلقت میں حکیم جل قدرتہٗ نے ایک یہ بھی حکمت رکھی ہے کہ شمال جانب بہ نسبت جنوبی جانب کے بلند ہے۔پھر خدائے عزوجل نے ایسا کیا ہی کیوں؟ اسی لیے نا، تاکہ پانی تمام روئے زمین پر بہہ کر اسے سیراب کر سکے اور آخر میں سمندر کی طرف بہہ جائے۔جیسے مکان کی چھت کو ایک طرف سے قدرے بلند اور دوسری جانب سے پست کر دیا جاتا ہے تاکہ بارش کا پانی قرار نہ پائے اور بہہ کر نکل جائے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو پانی تمام روئے زمین پر پھیل جاتا جس کی وجہ سے لوگوں کا کام رک جاتا، کوئی کام بھی نہ کیا جاسکتا، راستے کٹ جاتے (اس سے زمین کی گولائی میں فرق نہیں آتا، اس لیے کہ زمین اگرچہ واقعاً گول ہے لیکن اسی کے ساتھ پانی کے کرے سے نیچے ہے اور پانی دراصل اس سے اوپر ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے صرف اس لیے کہ اس پر بھی چند قسم کی مخلوقات کی تخلیق ہو سکے اور وہ اس پر رہ کر زندہ رہ سکیں، اس کا نصف شمالی حصہ پانی سے بلند کر دیا ہے اور پانی میں غرق ہے تاکہ اس جزیرہ نما حصے میں آبادی ہو سکے۔

علی ہذا القیاس، دوسرے جزائر بھی اسی غرض سے پانی کے اوپر کر دیے گئے ہیں، ورنہ باقاعدہ اس سے اوپر پانی ہونا چاہیے تھا اور اسے اس کے نیچے رہنا چاہیے تھا۔اگر اس مسئلے کو خوب سمجھنا چاہتے ہو تو علم ہیئت کی کتابیں دیکھو۔

پانی کی خصوصیات:۔

یہ پانی (من جملہ عناصرِ اربعہ کے تیسرا عنصر ہے) اگر اس کثرت سے نہ ہوتا اور چشموں، وادیوں اور نہروں کے ذریعے سے نہ بہتا تو انسانوں کو جو اپنے چوپاؤں اور مویشیوں کو پلانے، زراعتوں اور درختوں کو سیراب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس میں بہت بڑی تنگی واقع ہوتی اور نیز وحوش وطیور اور درندے پیتے ہیں یا مچھلیاں اور پانی کے جانور اس میں رہتے ہیں ان کے لیے سخت مشکل اور تکلیف ہو جاتی۔

اس کے علاوہ اس میں اور بھی فوائد ہیں جنہیں تم جانتے تو ہو مگر ان کی عظمت اور وقعت سے غافل ہو۔تو دیکھو کہ علاوہ اس بزرگ اور گرانقدر فائدے کے جو اس میں ہے اور وہ یہ کہ اسی کے ذریعے سے تمام روئے زمین کے حیوانات اور نباتات زندہ ہیں۔یہ دیگر بہت سی پینے کی چیزوں میں بھی شامل کیا جاتا ہے۔(مثلاً ستو اور دوا وغیرہ میں) تاکہ وہ نرم ہو جائیں اور پینے والے کو گوارا معلوم ہوں۔اسی سے بدن اور لباس کا میل صاف کیا جاتا ہے۔اسی سے مٹی گوندکر ظروف وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔اسی سے آگ کا ضرر دفع کیا جاتا ہے۔جب کبھی مشتعل ہو جائے۔اور لوگ اس سے تکلیف پانے لگیں۔اسی سے تھکا ہوا آدمی اپنی تعب وتکلیف سے آرام پاتا ہے۔

علی ہذا القیاس اور بھی بہت سے اغراض ہیں جن کی عظمت وقدر کو تم اسی وقت جان سکتے ہو جب اس کی ضرورت پڑے۔

پھر بھی اگر تم کو کچھ شک پڑتا ہو کہ اس قدر کثیر پانی کیوں دریاؤں میں پیدا کیا گیا اور کہو کہ اس سے کیا فائدہ ہے؟

تم کو معلوم ہو کہ یہی پانی دریا کے بہت سے قسم کے جانور اور مچھلیوں کا ماؤی اور مسکن ہے۔یہی موتی، یاقوت، عنبر، اور انواع واقسام کی چیزوں کا معدن ہے، جو دریاؤں

سے نکالی جاتی ہیں۔ اسی کے کنارے پر عود، بخوری اور طرح طرح کی خوشبودار چیزیں اور جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ (اگر اس کثرت سے پانی نہ ہوتا تو یہ چیزیں کیونکر پیدا اور مہیا ہو سکتی تھیں۔) علاوہ ازیں یہ بھی کہ آدمیوں کا مرکب ہے، (اس پر سوار ہو کر ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں۔ ان تجارتوں کا ذریعہ ہے جو دور دور کے شہروں سے وابستہ ہیں مثلاً چین سے عراق اور وہاں سے چین، بصرہ، کوفہ، دجلہ اور فرات کے ذریعے سے وغیرہ وغیرہ) اگر سوائے پشت انسان وحیوان کے اور کوئی ان تجارتی اشیاء کا متحمل نہ ہوتا تو تجارت خراب ہو جاتی اور اشیاء اپنے ہی شہروں میں رہ جاتیں اور اپنے ملک والوں کے ہاتھ میں رہتیں۔ کیونکہ ان کی بار برداری کی اجرت ان کی قیمتوں سے زیادہ ہو جاتی پھر تو کوئی بھی ان کے کہیں لے جانے کا ارادہ نہ کرتا، اور اس سے دو خرابیاں پیدا ہو جاتیں۔

(۱) یہ کہ بہت سی ایسی چیزیں نہ مل سکتیں جن کی آدمیوں کو ضرورت پڑتی ہے مثلاً دوا میں ایک سنائے مکی ہے یا عود چینی ہے یا آلو بخارہ ہے یا بلاد یورپ وایشیا کی غذائی یا دوائی دیگر چیزیں ہیں۔ اگر یہ صرف پیٹھ ہی پر لاد کر لائی جایا کرتیں سمندر و دریاؤں کا درمیانی واسطہ نہ ہوتا جن میں کشتیوں کے ذریعے سے لاتے ہیں تو یہ چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح پہنچ سکتی تھیں۔

(۲) ان لوگوں کی معاش کا سلسلہ قطع ہو جاتا جن کی زندگی معاشی طور پر اسی ذریعے سے منسلک اور بسر ہوتی ہے۔

اسی طرح ہوا ہے کہ اگر اس کثرت سے نہ ہوتی تو تمام آدمیوں کا دم اس دھوئیں اور بخارات سے گھٹ جاتا جو اس فضا میں بھرے رہتے ہیں، اور نہ اس میں اس قدر وسعت ہوتی کہ اس سے گہرے اور ہلکے بادل بن سکتے، جو اب ہوا کے استحالہ سے آہستہ آہستہ ابر بن جایا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ماقبل بیان کیا جا چکا ہے۔

آگ کے عنصر کا بیان:۔

آگ کا بھی یہی حال ہے (کہ حکمت و مصلحت کے ساتھ ضرورت کے موافق بنائی گئی ہے۔) کہ اگر یہ پانی اور ہوا کی طرح پھیلی رہتی تو سب کچھ تباہ ہو جاتا اور کوئی چارہ کار اس سے نہ تھا کہ اوقات معینہ پر اس کا ظہور ہوا کرتا، کیونکہ اکثر کاموں میں اس سے فائدہ ملتا ہے۔ لہذا اس کا خزانہ لکڑیوں میں جمع کیا گیا ہے جو ضرورت کے وقت ہی نکالی جاتی ہے اور پھر اس کو اس کے مادہ اور لکڑیوں کے ذریعے سے قائم رکھا جاتا ہے۔

پس نہ تو یہ ایسی ہے کہ ہمیشہ ہی لکڑی اور مادے کے ذریعے سے باقی رکھی جائے، اور نہ تمام عالم میں اس طرح پھیلی رہتی ہے کہ تمام اشیاء کو جلا دے، بلکہ ایک خاص اندازے کے ساتھ تہیئۂ قائم رکھی گئی ہے تا کہ اس کی منفعتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور اس کے ضرر سے بچا جا سکے۔

اس میں ایک اور صفت یہ بھی ہے کہ اس کی خصوصیت صرف آدمی سے رکھی گئی ہے، حیونوں کو اس کی ضرورت نہیں قرار دی گئی، اگر آگ نہ ہوتی تو بڑا سخت نقصان انسانی معاش میں واقع ہوتا۔ (مثلاً لوہے کی اشیاء اسی کے ذریعے بنائی جاتی ہیں، کیونکہ زراعت، عمارت، تجارت، صنعت کے آلات تیار کیے جاتے ہیں، زرگری میں اس کی ضرورت ہے، ظروف سازی میں بھی اسی سے مدد ملتی ہے۔ عمارات کے لیے اینٹیں اور چونا بنانے میں معاون ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تو ہر روز ہی کھانا پکانے میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ (پھر اگر آگ نہ ہوتی تو انسانی زندگی کس قدر تنگ ہو جاتی۔)

لیکن رہے بہائم۔ وہ تو اسے استعمال ہی نہیں کرتے اور نہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور چونکہ ایسا ہی خدا کی طرف سے مقدر ہو چکا تھا کہ صرف آدمی ہی اس سے فائدہ حاصل کریں۔ لہذا انسان کے لیے ہتھیلیاں اور انگلیاں بنا دی گئی تا کہ اس کے روشن کرنے اور

استعمال کرنے میں ان سے مدد ملے اور بہائم کو یہ چیزیں نہیں دی گئیں، لیکن ان کو معاش کی تکلیف پر صبر کی طاقت دی گئی تا کہ آگ نہ ملنے سے جو نقصان انسان کو پہنچتا وہ ان کو نہ پہنچے

میں تم کو اس کی ایک چھوٹی سی چیز کا نفع بتاتا ہوں جو نہایت ہی قابلِ قدر و وقعت ہے، وہ یہی چراغ ہے (جو آگ سے روشن ہوتا ہے) جسے لوگ روشن کرتے ہیں، اگر یہ صفت نہ ہوتی تو (شب کے وقت) آدمیوں کی زندگی اس طرح بسر ہوتی گویا قبرستان میں دفن ہیں تو کس سے ممکن ہوسکتا کہ کچھ لکھے، یا پڑھے اور یاد کرے، سینے پرونے کا کام کس طرح کرتا اور اس شخص کا کیا حال ہوتا جسے شب کے کسی حصے میں کوئی درد اٹھتا یا بیماری لاحق ہوتی اور اسے مرہم لگانے یا سفوف یا کسی اور ایسی ہی چیز کی ضرورت ہوتی جس سے وہ اپنا علاج کرے اور اس سے شفاء حاصل کرے (تو پھر اندھیری رات میں کیا کرسکتا تھا؟) لہذا خدائے تعالیٰ نے آدمیوں کو یہ سکھایا کہ تم اپنی ضرورتوں کے واسطے اس ترکیب سے روشن کرلیا کرو۔

لیکن اس کے دوسرے فوائد جو کھانا پکانے اور بدن کو گرمی پہنچانے، گیلی چیزوں کو خشک کرنے اور سخت چیزوں کو نرم یا تحلیل کرنے اور علی ہذا القیاس دیگر چیزوں میں ہیں وہ اس قدر ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہوسکتا اور ایسے عیاں ہیں کہ ان کے ظاہر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

بارش کی خصوصیات:۔

آسمان کے صاف ہو جانے اور بارش کے برسنے پر غور کرو (یعنی ان دونوں مختلف حالتوں کو غور سے دیکھو کہ ایک وقت آسمان صاف ہو جاتا ہے، دوسرے وقت ابر چھا جاتا ہے اور بارش ہونے لگتی ہے۔) کیونکہ یکے بعد دیگرے اس عالم میں اس طور پر واقع ہوتے ہیں جس میں اس (عالم) کی بہتری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ رہتا تو اس

سے عالم میں خرابی پڑ جاتی۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کبھی متواتر بارش ہونے لگتی ہے تو سبزیوں وغیرہ میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے، حیوانات کے بدنوں میں استرخا ہو جاتا ہے، اور ہوا میں برودت بڑھ جاتی ہے تو طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ راستے اور سڑکیں خراب ہو جاتی ہیں اور جب کبھی عرصے تک آسمان کھلا رہتا ہے (یعنی بارش نہیں ہوتی) تو زمین خشک ہو جاتی ہے، نباتات جل جاتے ہیں چشمے اور ندیوں کا پانی کم ہو جاتا ہے، اس سے انسان کو نقصان پہنچتا ہے اور ہوا میں یبوست (خشکی) پیدا ہو جاتی ہے۔ تو مختلف قسم کے امراض پیدا ہونے لگتے ہیں۔

لیکن جب یکے بعد دیگرے موسموں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے تو ہوا معتدل رہتی ہے ہر ایک ان میں سے دوسرے کے ضرر کو دفع کرتا رہتا ہے، تو تمام چیزیں باقاعدہ ٹھیک اور درست رہتی ہیں۔

اگر کوئی معترض یہ اعتراض کرے کہ پھر ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ ان میں سے کسی میں کچھ ضرر نہ ہوتا۔ (یعنی اگر بارش ہمیشہ برسا کرتی تب بھی آدمیوں کو نقصان نہ پہنچتا، اگر ہمیشہ مطلع صاف ہی رہتا تو بھی ان کو کچھ ضرر نہ پہنچتا، ایسا کیوں نہ کیا گیا؟)

جواب یہ ہے کہ آدمی کو مکلّف پیدا کیا گیا ہے اس لیے کسی قدر تکلیف پہنچتی رہے تا کہ وہ معصیتوں سے باز رہے مثلاً جب انسان بیمار ہوتا ہے تو اسے تلخ اور بدمزہ دوائیں پینے کی ضرورت پڑتی ہے، لہذا اس تلخی اور بدمزگی کو برداشت کرے، مرض کی تکلیف برداشت کرے سرکشی، کبر اور غرور نہ کرے اور اپنے مالک و خالق کی بارگاہ میں اپنی صحت و درستی بدن کی دعا کرتا رہے، بدکاریوں سے باز رہے اور ان افعال پر قائم رہے جن میں اس کا فائدہ بھی ہو اور خوشنودی رب بھی۔ اگر کوئی بادشاہ اپنی رعایا کو ہزاروں اور لاکھوں

اشرفیاں اور روپے تقسیم کردے تو کیا اس بادشاہ کی عظمت عوام الناس کے دلوں میں نہ پیدا ہو گی اور کیا اس سے اس کی سخاوت کو شہرہ نہ ہو جائے گا؟ حالانکہ اس بات کو اس بارش جیسی نعمت سے کیا نسبت ہے، جو آبادیوں، شہروں اور ملکوں نیز تمام روئے زمین اور باشندوں کو سیراب کرتی ہے، کہیں زیادہ ہے ان لاکھوں کروڑوں اشرفیوں اور رپوں سے۔

تم ذرا غور کرو! کہ اس تھوڑی سی بارش کی کس قدر بڑی عظمت ہے لوگوں کے لیے اور کتنی بڑی نعمت ہے؟ حالانکہ یہ لوگ اس سے غافل ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی چھوٹی سی ضرورت (بارش ہونے یا دیر تک نہ ہونے سے) رک جاتی ہے تو ملامت کرنے لگتا ہے اور ناراض ہوتا ہے اس ذلیل و کمتر سی بات کو ترجیح دیتا ہے لیکن کبھی اس بڑی منفعت پر غور نہیں کرتا جو نہایت ہی قابل قدر ہے اور جس کا انجام بہت اچھا ہے۔

یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ اسے اس عظیم القدر نعمت اور اس کے فائدوں کی پوری معرفت نہیں ہے۔

بارش کے بلندی سے زمین پر برسنے اور اس کی مصلحت پر غور کرو! صرف اس لیے بلندی سے برسایا جاتا ہے کہ اونچی اور سخت زمینوں پر بھی پڑے اور اس کو اچھی طرح سیراب کر سکے، اور اگر ایسا ہوتا کہ کسی ایک گوشے سے پانی آیا کرتا تو ان مقامات پر نہ پہنچ سکتا جو بلند ہیں اور وہاں زراعت وغیرہ نہ ہو سکتی، دیکھو! کہ وہ زمین جس میں پانی سینچ کر زراعت کی جاتی ہے، بہت کم ہے (اور اگر ہے بھی تو اس کی آبپاشی میں صرف کثیر پڑتا ہے جس سے کاشتکاروں کو بہت کم نفع اپنی زراعت سے ہوتا ہے۔ لہذا ایسا مقرر کیا گیا ہے کہ بارش بلندی سے برسا کرے تاکہ ہر بلند و پست مقام پر پانی پہنچ جائے۔)

لہذا بارش ہی ایسی چیز ہے کہ تمام زمین پر محیط ہو جاتی ہے اور بسا اوقات ان وسیع صحراؤں اور پہاڑوں کے دامنوں میں بھی زراعت کر لی جاتی ہے تو بہت سا غلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

انہی بارشوں کے سبب سے آدمیوں کی وہ مشقت بھی جاتی رہتی ہے جو ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر پانی لانے، لے جانے میں ہوتی ہے، اور جو تنازعات اور جھگڑے، فسادات اور ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی واقع ہوتے ہیں کہ ایک غلبے اور قوت والا آدمی تو پانی سے فائدہ حاصل کر لیتا ہے لیکن دوسرا کمزور اور ناتوان آدمی اس سے محروم رہتا ہے، وہ رفع ہو جاتا ہے۔ پھر چونکہ (بارش کے لیے) یہ مقدر کیا تھا کہ اوپر سے زمین پر برسے، لہذا ایسا بنایا گیا کہ چھڑکاؤ کے طور پر زمین پر پڑے تاکہ زمین کے اندر جذب ہو کر اسے سیراب کر سکے اور اگر زور سے بہتا ہوا آتا اور زمین پر سیل کی طرح گرتا تو اس میں جذب نہ ہوتا۔

پھر یہ بھی ہوتا کہ کھڑی فصلوں کو تباہ کر دیتا، لہذا ایسا مقرر ہوا کہ آہستہ آہستہ قطروں کی صورت میں برسا کرے تاکہ بوئے ہوئے دانے خراب نہ ہوں، زمین سیراب ہو اور زمین اور کھڑی زراعتیں اس سے زندہ ہوتی رہیں۔

اس طرح برسنے میں اور بھی مصلحتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ بدنوں میں نرمی اور لینت پیدا کرتا ہے۔

(۲) یہ کہ ہوا کی کدورت کو صاف و شفاف کرتا ہے جس سے وبا و امراض دفع ہوتے ہیں جو ہوا کی خرابی سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) درخت اور زراعتوں میں جو بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں جیسے یرقان ہے اسے دفع کر دیتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اور بھی فوائد ہیں:۔

پس اگر کوئی معترض یہ کہے کہ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ اس بارش کے سبب سے کسی سال بہت زیادہ نقصان بھی پہنچتا ہے جب کہ یہ شدت سے برستا ہے یا اولے (یعنی

برف) پڑتے ہیں جن سے فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں، اور ہوا میں بخارات پیدا کر دیتا ہے جس سے بدنوں میں بہت سے امراض و آفات حادث ہوتے ہیں، تو اس سے کہا جائے گا کہ:

ہاں یہ زیادتی بھی کبھی انسان ہی کی اصلاح اور اس کی معصیتوں میں پڑے رہنے سے روکنے کے لیے ہوتی ہے۔ لہذا وہ فائدہ جو اس کے دین کی اصلاح کے لیے ہوگا وہ یقیناً اس نقصان سے بہتر ہوگا جو اس کے مال میں واقع ہوتا ہے۔ (یعنی اگر چہ زیادتی بارش سے انسان کے مال کا نقصان ہو گیا، اس کو بدنی تکلیف پہنچی لیکن اسے متنبہ تو ہوا، کہ ہمارا کوئی زبردست خالق بھی ہے جو ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس سے ڈرتا رہے تا کہ اس کے دین کی اصلاح ہو جائے جس کا فائدہ ابدی اور غیر منقطع ہے۔)

پہاڑوں کی حکمت:۔

مفضل! ان پہاڑوں کو دیکھو! جو مٹی اور پتھر سے جما جما کر بنائے گئے ہیں جنہیں غافل لوگ بے کار اور بلاضرورت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان سے بہت کچھ فوائد پہنچتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ کہ:

(۱) ان پر برف پڑتی ہے اور وہ ان کی چوٹیوں پر باقی رہتی ہے جسے ضرورت ہو وہ اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور جو برف پگل جاتی ہے اس سے کثیر تعداد میں پانی کے چشمے بہتے ہیں جن سے بڑی بڑی نہریں ہو جاتی ہیں۔

(۲) ان پر ایسی ایسی جڑی بوٹیاں اور نباتات روئیدہ ہوتے ہیں جو ہموار اور نشیبی زمینوں میں نہیں ہوتے۔

(۳) ان میں وحشی وضرر رساں درندوں کے لیے غار اور درے ہیں۔

(۴) دشمنوں سے بچنے کے لیے ان میں بلند قلعے بھی بنا لیے جاتے ہیں۔

(۵) انہیں تراش کر مکان بناتے اور چکیوں وغیرہ میں صرف کرتے ہیں۔

(۶) ان میں قسم قسم کے جواہرات کی کانیں بھی پائی جاتی ہیں، ان کے علاوہ اور بھی فائدے ہیں جنہیں وہی جانتا ہے جس نے اپنے علم قدیم سابق کے ذریعے سے ان کو باندازہ معین ونصب کر دیا ہے۔

معدنیات کا بیان:۔

مفضل! ان معدنوں کو دیکھو! جو ان سے مختلف قسم کے جواہر نکلتے ہیں، ان پر غور و فکر کرو! مثلاً کچ، چونا، جپسم (ایک قسم کا چونا ہے جو کچ کے کام آتا ہے۔ جس کو عرف عام میں جپسن کہتے ہیں)، ہڑتال، مردار سنگ، پارہ، تانبا، رانگہ (رانگا)، چاندی، سونا، زبرجد، یاقوت، زمرد، اور انواع و اقسام کے پتھر اور علیٰ ہذا القیاس، جو ان سے تارکول، مومیائی، گندھک، نفط (ایک قسم کا تیل ہے) نمک وغیرہ نکلتے ہیں جنہیں لوگ اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔

کیا یہ بات کسی عقلمند سے پوشیدہ ہے کہ یہ تمام ذخیرہ آدمیوں ہی کے لیے جمع کیا گیا ہے جسے وہ نکال نکال کر اپنی ضروریات کے وقت استعمال کرتا ہے؟

پھر یہ بھی کہ آدمیوں نے جو یہ حرص کیا کہ ہم سونا، چاندی بنا لیں اور اس میں کوشش صرف کی، ان کو کچھ بن نہ آئی اور تدبیر ان کی قاصر رہی۔ ورنہ اگر یہ لوگ جیسا چاہتے تھے پا جاتے اور اس کا علم ان کو حاصل ہو جاتا تو لامحالہ یہ علم ظاہر ہو جاتا اور ہر چار طرف پھیل جاتا، پھر تو چاندی سونا اس کثرت سے بننے لگتا کہ لوگوں کے نزدیک اس کی قدر و قیمت ہی نہ باقی رہتی اور جو فائدہ خرید وفروخت اور معاملات مین اس سے پہنچتا ہے وہ فوت ہو جاتا۔ نہ بادشاہ کے پاس مال ہی آتا اور نہ کوئی اپنی اولاد کے واسطے ذخیرہ ہی کرتا۔

بایں ہمہ یہ بھی ہوا کہ آدمیوں کو تانبے (اور جست کو ملا کر) پیتل، ریت سے

شیشہ، رانگے سے چاندی اور چاندی سے سونا وغیرہ بنانے کی تدبیر و ترکیب بتا دی گئی ہے جن میں کچھ مضرت نہیں ہے (کیونکہ ایسے جاننے والے اور کرنے والے کم ہیں جن کی وجہ سے ضرر عام نہیں ہے اور نہ اس سے نظام عالم میں خلل واقع ہوتا ہے، بخلاف اس کے اگر عام طور پر ہر شخص سونا، چاندی بنا لیا کرتا، تو اولاً یہ ایک بے قدر چیز ہو جاتی، دوسرے یہ کہ معاملات وغیرہ میں اس سے مدد نہ لی جاتی، تیسرے یہ کہ کوئی اس کو ذخیرہ نہ کرتا، کیونکہ ہر شخص اس کا بنانا جانتا، کیا ایسی عزیز چیز ہے جس کو ذخیرہ کیا جائے وغیرہ وغیرہ نقصانات لوگوں کو پہنچتے۔)

دیکھو! کہ جس میں کچھ نقصان نہ تھا وہ تو ان کو بتا دیا گیا ہے اور جو نقصان رساں تھا (عام طور پر ہر شخص کا کیمیا گر ہو جانا) وہ انہیں نہ بتایا گیا۔

اور جو شخص کسی کان میں داخل ہو تو اسے ایسی بڑی بڑی ندیاں دکھائی دیں گی جن میں برابر کثرت سے پانی بہہ رہا ہے، نہ ان کی تہہ معلوم ہو سکتی ہے اور نہ ان کے عبور کرنے کی کوئی تدبیر ہے اور اس کے بعد اسے چاندی کے پہاڑ ہی پہاڑ کھڑے ہوئے ملیں گے۔

غور کرو کہ اس میں خالق حکیم کی کیا حکمت و تدبیر ہے۔ اس نے یہ چاہا ہے کہ بندوں کو اپنی قدرت اور اپنے خزانوں کی وسعت دکھا دے تاکہ وہ جان لیں کہ اگر پروردگار چاہے تو ہمیں پہاڑوں کی بقدر چاندی عطا کر دے تو کر سکتا ہے لیکن اس میں ان کے لیے کچھ بہبودی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس میں وہی خرابی واقع ہوتی جو ہم نے بیان کی ہے۔ کہ ان جواہرات کی قدر لوگوں کی نگاہوں میں نہ رہتی اور ان سے بہت کم فائدہ اٹھاتے۔ اسے اس طرح سمجھو کہ کوئی نئی چیز جسے آدمی ایجاد کرتا ہے۔ مثلاً ظروف یا دوسرے اسباب جب تک کہ وہ نئی چیز کمیاب و نادرالوجود رہتی ہے تب ہی تک نفیس و گرانقدر اور گراں قیمت ہوتی ہے۔ ہر چیز اس وقت تک نفیس سمجھی جاتی ہے جب تک کمیاب ہو۔

نباتات کا بیان:-

مفضل! ان نباتات اور ان کی انواع و اقسام کی ضرورتوں پر غور کرو۔ پھل تو غذا کے کام آتے ہیں۔ خشک گھاس جانوروں کی خوراک ہے۔ لکڑی جلانے اور نجاری (بڑھئی) وغیرہ کے کام آتی ہے۔ چھال، پتیاں، موٹی اور پتلی جڑیں اور گوند طرح طرح کے فائدوں کے لیے ہیں۔

دیکھو! اگر یہ پھل جنہیں ہم اپنی غذا میں صرف کرتے ہیں، ایک ہی جگہ کہیں زمین پر مل جاتے اور ان شاخوں میں نہ لگتے جو ان کی حامل ہوتی ہیں، تو ہماری زندگی کے امور میں کس قدر خلل واقع ہوتا۔ اگرچہ غذا تو بہم پہنچ جاتی مگر لکڑی کے تختے وغیرہ، خشک گھاس اور تمام ان چیزوں میں بھی جنہیں ہم نے بیان کیا ہے بہت بڑے بڑے فائدے ہیں اور نہایت قابل قدر و وقعت ہیں۔ (وہ کہاں سے ہاتھ آتے، اگر پھل بغیر درخت کے کسی ایک جگہ زمین پر رکھے ہوئے مل جایا کرتے۔)

علاوہ بریں، نباتات میں اس کے حسن منظر اور شادابی سے وہ لذت و فرحت حاصل ہے جس کے برابر تمام جہان میں منظر اور حسن نظر جیسی کوئی چیز نہیں۔ (درختوں کا سبزہ دیکھ کر آنکھوں میں خنکی پیدا ہوتی ہے دل کو فرحت ہوتی ہے، طبیعت کی پژمردگی دفع ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔)

مفضل! اس افزائش کو خیال کرو جو زراعت میں قائم کی گئی ہے۔ کہ دانے سے سو دانے اور کچھ کم و بیش بھی پیدا ہوتے ہیں، حالانکہ (عقلاً) تجویز یہ کیا جاتا ہے کہ ایک دانے سے ایک ہی دانہ پیدا ہو سکے گا۔ تو پھر کیوں اس قدر افزائش ہو جاتی ہے، اسی لیے نا، کہ غلے میں وسعت ہو جائے کہ بیج ڈالنے کے بھی کام آئے جو کاشتکاروں کے لیے آئندہ فصل کی خوراک کا بھی سامان رہے۔

دیکھو! جب کوئی بادشاہ کسی شہر کو آباد کرنا چاہتا ہے تو وہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کو اس قدر غلہ دیا جائے کہ جس سے بیج بھی بویا جا سکے اور زراعت کے تیار ہو جانے تک غذا میں بھی استعمال کیا جا سکے۔

دیکھو! یہ مثال کس طرح حکیم مطلق (یعنی باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ) کی تدبیر میں پہلے ہی گزری ہے کہ زراعت میں اس قدر افزائش ہونی چاہیے، تا کہ غذا اور کاشت دونوں ضرورتوں کے لیے کافی ہو سکے۔

علیٰ ہذا القیاس، درخت، نباتات اور نخل خرما کا حال ہے کہ کثرت سے ان میں پھل لگتے ہیں، تم دیکھتے ہو گے کہ جڑ تو ایک ہی ہے مگر اسکے چاروں طرف کتنے اس کے بچے (شاخیں) ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟

اسی لیے، تا کہ لوگ اسے توڑ کر اپنی ضرورت میں استعمال کریں اور دوبارہ اس کا بیج زمین میں بویا جا سکے۔ اگر ایک ہی جڑ رہ جاتی، اس میں شاخیں نہ پھوٹتیں اور یہ افزائش نہ ہوتی تو بالکل ممکن نہ ہوتا کہ کسی کام یا بونے کے لیے اس میں سے کوئی چیز توڑی جائے۔ پھر اگر ناگہانی بلا آ جاتی تو اصل ہی فنا ہو جاتی اور اس کے قائم مقام دوسرا درخت نہ ہو سکتا۔

(لہذا ایسا مقرر کیا گیا کہ ان کے بیج یا شاخیں آئندہ ایسے ہی درخت پیدا کرنے کے کام میں آتی رہیں۔ ان میں یہ طاقت دی گئی ہے کہ ویسے ہی درخت اگائیں تا کہ اخراج مثل کا قاعدہ جاری رہے اور درختوں کی نسل قطع نہ ہو)

مفضل! مسور، ماش، باقلا وغیرہ دانوں کے پیدا ہونے پر بھی خیال کرو، یہ تمام دانے ایک ایسی چیز کے اندر پیدا ہوتے ہیں جو مثل چھلی کے ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کو سخت اور مستحکم ہونے تک آفتوں سے حفاظت کرے جیسا کہ مشیمہ (جھلی جس میں بچہ ماں کے شکم میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ جنین کے اوپر اسی غرض سے لپٹا ہوا ہوتا ہے کہ اسے ہر قسم

سے صدمے محفوظ رکھے۔) لیکن گیہوں اور اس کے مشابہہ جو دانے ہیں وہ تہہ بہ تہہ ان سخت چھلکوں کے اندر ہوتے ہیں جن کے سروں پر بالیوں کی نوکیں برچھی کی طرح تیز نکلی ہوتی ہیں تا کہ پرندوں وغیرہ کو اس سے باز رکھیں اور کاشتکاروں کو زیادہ سے زیادہ دانے حاصل ہو سکیں۔ اگر یہ تیز نوکیں ان پر نہ ہوتیں تو پرندے توڑ لیا کرتے اور کاشتکار بے چارے دیکھتے رہ جاتے۔

اگر کوئی معترض کہے کہ پرندے گیہوں وغیرہ کے دانوں کو کیا نہیں پا سکتے؟

تو اس کو جواب دیا جائے گا کہ ہاں، پا تو سکتے ہیں اور یہی ان کے لیے مقدر و معین بھی کیا گیا ہے۔ کیونکہ پرندے بھی خدائے تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور ان کے لیے بھی پروردگار عالم نے زمین کی پیداوار میں سے ایک حصہ قرار دیا ہے، لیکن یہ دانے ان پردوں میں اس لیے محفوظ کیے گئے ہیں کہ پرندے ان پر پورا قبضہ نہ پا سکیں، جس سے ان کو خواہ مخواہ توڑ کر خراب کریں اور زیادہ نقصان کر دیں، کیونکہ اگر یہ پرندے دانوں کو کھلا ہوا پاتے اور ان پر کوئی محافظ بھی نہ دیکھتے تو دانوں پر ٹوٹ پڑتے اور تباہ و برباد کر ڈالتے، جس سے یہ خرابی بھی لاحق ہو جاتی کہ پرندوں کو سوء ہضم ہو جاتا اور وہ مر جاتے۔

دوسرے کہ کاشتکار بے چارے اپنے کھیتوں سے خالی ہاتھ واپس آتے ......

لہذا یہ حفاظتیں ان دانوں پر قائم کی گئیں، تا کہ انہیں بچائے رکھیں، اب اگر پرندے اس سے پاتے بھی ہیں تو حسب ضرورت، جس سے اپنی مقررہ قوت حاصل کر سکیں اور انسانوں کے لیے بھی بچ رہے۔ کیونکہ وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں اس لیے کہ انہیں کی کوششوں سے یہ سب کچھ پیداوار لہلہاتی ہے۔

درختوں اور قسم قسم کے نباتات کی پیدائش کی حکمت پر غور کرو، چونکہ ان کو مثل حیوانات کے غذا کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، مگر حیوانوں کی طرح ان کے نہ منہ ہیں نہ قوت

ارادہ وحرکت، جس سے وہ اپنی غذا حاصل کرنے کی سعی کرسکیں۔

لہذا ان کی جڑیں زمین میں مضبوط قائم کی گئیں تاکہ ان کے ذریعے سے اپنی غذا لے کر شاخوں اور پتیوں اور پھلوں تک پہنچائیں، زمین ان کے لیے مثل ماں کے ہے اور جڑیں بجائے منہ کے ہیں جن سے غذا حاصل کرتے ہیں جیسے حیوانات کے بچے اپنی ماؤں کے پستانوں کو منہ میں لے کر دودھ پیتے ہیں۔

تم دیکھتے نہیں کہ، خیموں اور چھولداریوں کی عمودیں کس طرح سے طنابوں سے باندھ کر ہر طرف سے کھینچ دی جاتی ہیں، تاکہ خیمے سیدھے کھڑے رہیں،

علیٰ ہذا القیاس، تم ایک نبات کو بھی ایسا ہی پاؤ گے کہ ان کی جڑیں زمین کے اندر ہر طرف پھیلی ہیں تاکہ درختوں کو پکڑے رہیں اور قائم رکھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنے بڑے بڑے کھجور وغیرہ کے درخت آندھیوں میں کیسے کھڑے رہ سکتے تھے۔

دیکھو! کہ خلاق دوعالم کی حکمت وصناعت (خیمہ بنانے) کی حکمت سے کیونکہ سابق ہوگئی، وہ تدبیر جیسے کاری گر خیموں اور چھولداریوں کے قائم رکھنے میں صرف کرتے ہیں، یعنی درختوں کی حکمت پر انسانوں نے اپنی ضروریات زندگی کی اولین چیز کو منحصر کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ صنعت اس خلقت سے عبارت ہے جس پر اشجار کو قائم کیا گیا ہے۔

مفضل! پتوں کی پیدائش کو غور سے دیکھو! تمہیں ان کے اندر جڑوں کی طرح کی رگیں پھیلی ہوئی معلوم ہوں گی جو پتوں کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور بعض باریک ہوں گی جو ان موٹی رگوں کے درمیان سے گزرتی ہیں نہایت ہی مضبوط وباریک بنی ہوئی ہیں، جن کو اگر کوئی انسان بنانا چاہے تو ہرگز ان جیسی نہیں بنا سکتا، علاوہ اس کے آلات، حرکت، تدبیر اور کلام کی ضرورت ہوئی۔ (ایک دوسرے سے مشورے کرتے کہ کس طرح

بنائی جائیں وغیرہ)

یہاں دیکھو تو! فصل بہار کے چند ہی دنوں میں اس قدر پتیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ تمام پہاڑ اور نشیبی مقامات اور زمین کے تمام قطعات بلا حرکت اور بغیر بولے چالے (بغیر کلام کیے) صرف ایک ارادے کے ذریعے سے جو تمام چیزوں میں نافذ ہے اور صرف ایک حکم لازم الاطاعت سے بھر جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ان باریک رگوں کی علت وسبب کو بھی معلوم کرلو! یہ اس لیے ان پتیوں کے اندر داخل کی گئی ہیں کہ اسے سیراب رکھیں اور پانی کو ان تک پہنچائیں، جیسے جسم کے اندر کی رگیں صرف اس لیے پھیلی ہوئی ہیں تاکہ ہر جزو کو غذا پہنچاتی رہیں۔

پتیوں کی موٹی رگوں میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی صلابت اور مضبوطی کے ذریعے سے پتیوں سے بہت مشابہ ہیں جو کپڑوں کے پارچوں وغیرہ سے (تراش) کر بنائی جاتی ہیں اور جن میں طول وعرض لمبی لمبی سینکیں لگائی جاتی ہیں تاکہ اس کو پکڑے رہیں اور ہلنے جلنے نہ پائیں۔

پس صناعت (ہاتھ سے پتیوں کا بنانا) خلقت (خدائی ساخت) کی ایک نقل ہے اگرچہ اس کی پوری حقیقت تک پہنچنا محال ہے (لوگوں نے کپڑے اور کاغذ وغیرہ کے کیسے کیسے گل بوٹے جھاڑ، بیل، درخت بنائے مگر "چہ نسبت خاک را نہ عالم پاک" مصنوعی چیز حقیقت سے بہت دور ہوتی ہے، اول تو نقل ہی پورے طور پر مشابہ اصل کے نہیں ہوتی، دوسرے فطری قوی نہیں آسکتے جن سے اصلی درختوں کی حیات ہے۔)

اس گٹھلی اور بیج کی علت کو خیال کرو! کہ یہ پھل کے اندرونی حصے میں قرار دی گئی ہے تاکہ اگر کوئی چیز اصل درخت کو فنا کردے تو یہ اس کے قائم مقام ہو سکے۔ جیسے کوئی نہایت ہی نفیس چیز جس کی ضرورت بہت پڑتی ہو کئی کئی مقاموں پر رکھ دی جاتی ہے تاکہ اگر

کوئی حادثہ ایک مقام پر رونما ہو جائے تو وہ شئے دوسرے مقام پر دستیاب ہو سکے۔ (اسی طرح یہ گٹھلیاں اور بیج ہزاروں پھلوں کے اندر پیدا کر دیے گئے تا کہ وقت ضرورت کام آسکیں)

پھر یہ بھی ہے کہ اپنی صلابت اور سختی سے پھلوں کی نرمی و رقت کو نہیں روکتے۔ اگر یہ بیج اس کے اندر نہ ہوتے تو یہ پھل پھٹ جاتے اور ان میں جلدی خرابی پیدا ہو جاتی۔

بعض بیج اور گٹھلیاں ایسی بھی ہیں جو کہ کھائی جاتی ہیں اور ان سے تیل بھی نکالا جاتا ہے جو مختلف مصلحتوں میں کام آتا ہے اور جب تم کو گٹھلی اور بیج کی ضرورت اور غرض معلوم ہوگئی تو اس پر غور کرو کہ چھوارے کی گٹھلی کے اوپر مغز خرما اور انگور کے بیج کے اوپر مغز انگور کیا چیز ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے اور اس شکل پر کیوں نکلتا ہے؟ حالانکہ ممکن تھا کہ اس کے قائم مقام وہ شئے پیدا ہوتی جو کھانے میں استعمال نہ ہوتی جیسے سرو اور چنار وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اسی لیے تو لذیذ کھانے کی چیزیں اس کے اوپر پیدا ہوتی ہیں کہ انسان اس سے فائدہ اٹھائے۔

درختوں میں جو اور کئی قسم کی حکمتیں رکھی گئی ہیں ان پر غور کرو۔

تم انہیں دیکھو گے کہ ہر سال ان پر ایک مرتبہ خزاں آتی ہے، یہ اس وجہ سے کہ ان کی حرارت غریزہ شاخوں میں جمع ہو جاتی ہے اور اس کے اندر پھلوں کے مادے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان پر بہار آتی ہے اور پتیاں نکل آتی ہیں، اور تمہیں طرح طرح کے پھل اور میوے دیتے ہیں۔ جیسے تم کبھی اپنے سامنے قسم قسم کے کھانے رکھتے ہو جنہیں اپنے ہاتھ سے باری باری پکایا ہو (اسی طرح یہ مختلف قسم کے پھل ہیں)۔ تو دیکھو کہ شاخیں اپنے اپنے پھل لے کر تمہارے سامنے آتی ہیں گویا وہ تمہیں ان پھلوں کو اپنے اپنے ہاتھ سے دے رہی ہیں،۔

اور تم پھولوں کو دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے اپنی شاخوں پر آتے ہیں، گویا وہ خود

اپنے تئیں تمہارے روبرو پیش کرتے ہیں، یہ کس کا اندازہ قائم کیا ہوا ہے، کس نے ایسا بنایا ہے؟ اس نے جو مقتدر و حکیم ہے اور غرض کیا ہے؟ یہی کہ آدمی ان پھلوں اور پھولوں میں تفکر کرے۔ تعجب ہے ایسے آدمیوں سے کہ بجائے نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کے خود منعم حقیقی ہی کا انکار کرتے ہیں۔

اس انار پر غور کرو اور دیکھو کہ اس میں کیا عمدہ تدبیر و حکمت ہے؟ تم اس کے اندر یہ دیکھتے ہو، کہ چاروں طرف جمی ہوئی (زرد، زرد دیواریں ہیں جو مثل پردے کے ہیں۔) جھلیاں اور تہہ بہ تہہ دانے چنے ہوئے کھڑے ہوئے معلوم ہوں گے۔ جیسے کسی نے اپنے ہاتھ سے چن دیا ہے اور تم دانوں کو دیکھو گے کہ ہر ایک کئی حصوں پر منقسم ہے۔ اس کا ہر حصہ ایک بنے ہوئے پردے میں لپٹا ہوا ہے جو نہایت ہی عجیب و لطیف طور پر بنایا گیا ہے اور اوپر کا چھلکا ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اس صناعی میں حکمت یہ رکھی گئی ہے کہ انار کا مغز صرف دانہ ہی نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ صرف دانے ایک دوسرے کو بڑھا نہیں سکتے تھے، لہذا یہ جھلی اس کے اندر قائم کی گئی کہ اس کو غذا پہنچایا کرے۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ان دانوں کی جڑیں اس جھلی میں کس طرح جڑی ہوئی ہیں، پھر ان پر یہ پردے اس لیے قائم کیے گئے، کہ ان کو سمیٹے اور پکڑے رہیں، متحرک نہ ہونے پائیں اور ان سب کے اوپر ایک مستحکم چھلکا اڑھا دیا گیا، تا کہ آفتوں سے ان کی حفاظت کرتا رہے۔

یہ تو انار کی بہت سی صفتوں میں۔ یہ تھوڑی سی صفات کا ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ اس میں اور بھی بہت سی صفات موجود ہیں جنہیں وہ شخص بیان کر سکتا ہے جسے طول کلام مقصود ہو۔ لیکن میں نے جس قدر تم سے بیان کر دیا ہے اتنا ہی دلیل اور عبرت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔

مفضل! اس کمزور یقطین (ہر بیلدار درخت جس میں تانہ نہ ہو) کو دیکھو! کہ ایسے بڑے بڑے کدو، ککڑی، تربوزے کا متحمل رہتا ہے اور اس میں کیا کیا حکمتیں اور تدبیریں ہیں از بس کہ اس کے لیے یہ مقدر کیا گیا تھا کہ ایسے بڑے بڑے پھل وغیرہ کا متحمل ہوگا، تو اس کا درخت (بیل) بھی زمین پر پھیلا ہوا بنایا گیا، اور اگر سیدھا درخت ہوتا جیسے زراعت اور اشجار ہوتے ہیں، تو یہ ان پھلوں کا متحمل نہ ہوسکتا، اور قبل پختہ ہونے اور ان کی حد تک پہنچنے ہی کے ٹوٹ پڑتا،

لہذا، دیکھو! کہ کس طرح زمین پر پھلتا ہے تا کہ اس پر اپنے پھلوں کا بار رکھے اور اس کی طرف سے زمین ہی ان پھلوں کی متحمل رہے، تم دیکھتے ہوگے کہ کدو اور خربوزے کی جڑیں زمین پر بچھی ہوئی ہیں اور اس کے پھل زمین پر اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، جیسے کوئی بلی ہے کہ لیٹی ہوئی ہے اور اس کے پھلوں میں اس کے بچے ہیں جو دودھ پی رہے ہیں۔ (یہی بعینہ مثال کدو کے بیل اور اس کے پھلوں کی ہے۔)

غور کرو کہ یہ تمام قسم کی بیلیں انہیں فصلوں میں پیدا ہوتی ہیں جو ان کے لیے مناسب ہیں، مثلاً سخت گرمی اور حرارت کے اشتعال کے وقت تو کس طرح سے لوگ ان کو نہایت شوق اور خوشی کے ساتھ لیتے ہیں، اور اگر جاڑوں میں پیدا ہوا کرتے تو انسانوں کو ان سے نفرت ہوتی اور انہیں ناپسند کرتے، علاوہ اس کے ان سے جاڑوں کے موسم میں بدنوں کے اندر بیماریاں پیدا ہو جائیں۔

دیکھو! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ موسم سرما میں ککڑیاں تیار ہو جاتی ہیں، تو لوگ اس کے کھانے سے پرہیز کرتے ہیں، البتہ وہ حریص آدمی جسے اپنے نقصان اور خرابی کی پروا نہیں ہوتی، ضرور کھالیتا ہوگا۔

مفضل! کھجور کے درختوں کو خیال کرو، چونکہ ان میں ایسے مادہ درخت ہوتے

ہیں جنہیں حمل رکھانے کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے واسطے نر بھی پیدا کیے گئے جو بغیر باغبانی اور بونے کے حمل کر سکیں، تو ان میں سے جو درخت نر ہیں وہ حیوانات کے نروں کے مانند ہیں کہ دوسروں میں حمل قائم کرتے ہیں خور حامل نہیں ہوتے (درخت خرما کی دو قسمیں ہیں۔ نر اور مادہ جب تک نر کے پھول مادہ پر نہیں ڈالے جاتے تب تک مادہ میں اچھے پھل نہیں اگتے، اسی کا نام تدبیر ہے اسی کو تنقیح بھی کہتے ہیں، چونکہ اس بات کی شناخت ہندوستانیوں کو نہیں ہے اور نہ وہ مادہ خرما کو مدبر کرنا جانتے ہیں اسی سبب سے جو کھجور کے درخت ہندوستان میں ہیں ان میں اچھے پھل نہیں لگتے۔)

درخت خرما کے تنے کی ساخت پر غور کرو اور دیکھو کہ کیسا بنا ہے؟ تم اسے تانے بانے کی طرح پاؤ گے حالانکہ اس میں لمبے لمبے دھاگے نہیں ہیں پھر بھی ایسا بنایا گیا ہے جیسے ہاتھ سے کپڑے بنے جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے تا کہ سخت اور مضبوط رہیں، اور نخل ہو جانے کے بعد وزنی خوشوں کا بار اور تیز و تند ہواؤں کے جھونکوں کو برداشت کر لیں اور پودے تنا دار درخت ہو جانے کے بعد چھتوں اور پلوں وغیرہ کے کام آسکیں اور تم اس کے اندر دیکھو گے جیسے تانے بانے کے اجزاء ایک دوسرے میں داخل ہو گئے ہیں، اسی طرح طول وعرض میں بھی اس کے اجزاء داخل ہیں۔ اور پھر اس میں اس قسم کا استحکام ہے کہ آلات کے کام میں آتا ہے اگر اس میں پتھر جیسی سختی ہوتو چھتوں وغیرہ میں جہاں لکڑی استعمال کی جاتی ہیں مثلاً دروازے، جالیاں، تخت، اور صندوق وغیرہ کام نہ آسکتے۔

لکڑی میں ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ وہ پانی پر تیرتی ہے اور ہر شخص اس بات کو جانتا ہے مگر اس کی قیمت وقدر کو نہیں سمجھتا (کہ اس میں قادر مطلق نے کیا کیا مصلحتیں پنہاں کر دی ہیں) اگر یہ صفت اس میں نہ ہوتی تو بھلا کشتیاں اس سے کیونکر بن سکتیں جو پہاڑ جیسے بوجھ برداشت کر لیتی ہیں اور انسان کو بآسانی بغیر کسی محنت اور مشقت کے ایک

شہر سے دوسرے شہر میں تجارتی اسباب کے لے جانے کے لیے کس طرح حاصل ہوتی اور کیسی دشواری ان کو اشیائے تجارت کی باربرداری میں ہوتی، یہاں تک کہ بہت سی چیزیں کسی کسی شہر میں بالکل مفقود ہو جائیں، یا، یہ کہ بہت مشکل سے دستیاب ہو سکتیں اور زیادہ قیمت میں ملتیں۔

ان جڑی بوٹیوں پر غور کرو! کہ ان میں سے ہر ایک کو کیا کیا خواص عطا کیے گئے ہیں اور بعض دواؤں سے کس قدر اہم کام لیے جاتے ہیں یہ بوٹیاں جوڑوں کے اندر اتر جاتی ہیں، اور ان میں سے غلیظ اور فاسد مادوں کو نکالتی ہیں جیسے، شاہترہ ہے اور بعض مرہ سودا کو دفع کرتی ہیں، جیسے افیتمون، بعض ریاح کو تحلیل کرتی ہیں، جیسے سکنجبین، بعض ورم کو تحلیل کرتی ہیں جیسے عنب الثعلب۔ علیٰ ہذا القیاس اور بھی ان کی تاثیرات وافعال ہیں۔

کس نے ان میں یہ قوتیں قرار دیں؟ اسی قادر مطلق نے، جس نے ان کو پیدا کیا ہے تا کہ انسان ان سے فائدہ حاصل کریں اور کس نے آدمیوں کو ان کے سمجھنے کی قوت عطا فرمائی، صرف اسی نے جس نے ان تمام دواؤں میں یہ خاصیتیں رکھیں۔ بالفرض اور بخت و اتفاق سے کیوں کر یہ باتیں معلوم ہو سکتی ہیں؟ جیسا کہ قائلین بخت و اتفاق (دہریے) کہتے ہیں۔

اچھا، اسے (بالفرض) مان بھی لیا جائے کہ انسان ان چیزوں کو اپنے ذہن وذکاوت، فکر و تجربہ سے سمجھ بھی گیا، لیکن حیوانات انہیں کیونکر سمجھ گئے؟ (حالانکہ ان میں فہم و ذکاء نہیں ہے۔) یہاں تک کہ بعض درندے جب زخمی ہو جاتے ہیں تو اپنا علاج بعض جڑی بوٹیوں سے خود ہی کر لیتے ہیں اور تندرست ہو جاتے ہیں اور بعض پرندے جب انہیں قبض ہو جاتا ہے تو دریا کے پانی سے حقنہ لیتے اور تندرست ہو جاتے ہیں، ایسی ہی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔

شاید تم کو یہ شک ہو، کہ صحراؤں اور میدانوں میں جو نباتات پیدا ہوتے ہیں جہاں نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد، ان کا کیا فائدہ ہے؟ بالکل فضول اور بے کار ہیں؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ انہیں وحشیوں کی خوراک ہے اور ان کے دانے پرندوں کی غذائیں ہیں اور ان کی لکڑیاں اور شاخیں ایندھن کے کام آتی ہیں، لوگ انہیں استعمال کرتے ہیں۔

اس میں اور بھی باتیں ہیں۔

(۱) یہ کہ ان سے بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

(۲) یہ کہ ان سے کھال کو دباغت (صاف کرنا) دی جاتی ہے۔

(۳) یہ کہ ان سے کپڑے رنگے جاتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس اور بھی ان کے مصالح ہیں۔

تمہیں علم نہیں کہ تمام نباتات سے زیادہ ذلیل وحقیر چیز بَردی (ایک قسم کی نبات ہے جو عراق میں پیدا ہوتی ہے) وغیرہ ہے۔ ان میں بھی بہت سے فوائد ہیں:۔

(۱) ان سے کاغذ بنائے جاتے ہیں جن کی ضرورت بادشاہوں اور رعایا تک کو ہوتی ہے۔

(۲) انہی سے چٹائیاں بنائی جاتی ہیں، جنہیں تمام قسم کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) انہی سے ڈھکنے بنائے جاتے ہیں جن سے ظروف کو ڈھکتے ہیں۔

(۴) انہی سے شیشے وغیرہ کے ظروف کے اندر جو صندوقوں میں رکھے جاتے ہیں بھر دیتے ہیں تا کہ عیب دار نہ ہوں، ٹوٹیں نہیں۔ ایسے ہی اور بھی فوائد ہیں۔

پس عبرت حاصل کرو، ان قسم قسم کے اغراض وفوائد سے جنہیں تم چھوٹے سے جسم اور بڑے جسموں میں دیکھتے ہو اور نیز ان چیزوں سے جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور جن کی قدر و قیمت ہے۔ ان سب میں زیادہ بے قدر سرگین و براز (فضلہ) ہے جس کے

اندر خساست اور نجاست دونوں ہی جمع ہیں اور پھر ان کی قدر و قیمت اور فوائد پر بھی غور کرو۔ جو فوائد ان سے زراعتوں بقولات اور سبزیوں کو پہنچتے ہیں اور یہ ایسے فائدے ہیں جن کے برابر کوئی فائدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک تو ہے کہ کوئی ترکاری اچھی اور بہتر ہوتی ہی نہیں جب تک کھاد نہ ڈالی جائے۔ جسے لوگ گندی چیز سمجھتے ہیں اور اس کے پاس بھی جانے سے نفرت کرتے ہیں۔

یہ بھی جان لو کہ کسی شئے کی قدر محض اس کی قیمت ہی سے نہیں ہوتی بلکہ یہ دونوں باتیں دو بازاروں کے لحاظ سے الگ الگ اس کی دو قیمتیں ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز کسب معاش کے بازار میں بے قدر ہوتی ہے اور وہی چیز علم کے بازار میں نفیس سمجھی جاتی ہے۔(ایک علمی کتاب کا ورق کوئی بڑھئی کیا جان سکتا ہے کہ اس کی قیمت کیا ہے، لیکن ایک عالم جان سکتا ہے کہ اس کے برابر دنیا میں کوئی چیز نہیں، سلطنت بھی اس کی قیمت کے لیے کافی نہیں)

ایسا نہ ہونے پائے کہ تم کسی چیز کو اس کی قیمت کے کم ہونے کی وجہ سے بے قدر سمجھو(کیونکہ ہر چیز کا سودا الگ، بازار الگ، خریدار الگ ہیں)۔ دیکھو! اگر کیمیا گروں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ انسان کے گوہ (فضلہ) میں کیا خاصیت ہے تو اسے بہت ہی گراں قیمتوں میں خریدنے لگیں اور اس کی قیمت بڑھا دیں۔ (واقعی یہ بات ہے کہ علم کیمیا میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اکثر نسخے اس کے، بغیر انسانی براز (فضلہ) کی مدد کے تیار نہیں ہو سکتے۔)

مفضل! کہتے ہیں کہ اس موعظمت اور گفتگو کے دوران زوال کا وقت آ گیا، مولیٰ نماز کے لیے اُٹھے اور مجھے حکم دیا کہ تم کل صبح کو میرے پاس انشاءاللہ آنا۔

میں وہاں سے بہت ہی خوش خوش واپس آیا کہ کیا کیا انکشافات حضرت علیہ السلام نے واضح فرمائے اور خدا کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ کیا کچھ نہیں اس نے مجھے (حضرت علیہ السلام کے ذریعے سے) مرحمت فرمایا اور یہ شب نہایت ہی سرور کے ساتھ بسر کی۔

چوتھی نشست

آپ علیہ السلام نے پہلے یہ حمد اور نعت فرمائی:۔

منا التحميد والتسبيح والتعظيم والتقديس للاسم الاقدس والنور والاعظم العلى العلام ذى الجلال والاكرام ومنشئ الانام ومفنى العوالم والدهور وصاحب السر المستور والغيب المحظور والاسم المخزون والعلم المكنون وصلواته وبركاته على مبلغ وحيه ومودى رسالته الذى ابتعثه بشيرا ونذيرا وداعيا الى الله باذنه وسراجا منيرا ليهلك من هلك عن بينة ويحيى من حى عن بينة فعليه وعلى آله من بارئه الصلوات الطيبات والتحيات الزاكيات الناميات وعليه وعليهم السلام والرحمة والبركات فى الماضين والغابرين ابد الابدين ودهر الداهرين وهم اهله ومستحقه

پھر فرمایا:

مفضل! میں تم سے خلقت کی دلیلیں اور شواہد درستی تدبیر و ارادہ کی بابت (یعنی ہر

چیز اپنے موقع ومحل سے نہایت درست پیدا کی گئی، اور بقصد وارادہ خلق ہوئی ہے نہ کہ خود بخود) جوانسان، حیوان، نباتات اور درخت وغیرہ میں ہے، ایسی مفصل بیان کردی ہیں کہ عبرت حاصل کرنے والوں کے واسطے عبرت ہو سکے۔

آفات وحوادث تادیب واصلاح کے لیے ہیں:۔

اب میں تم سے ان آفات اور حوادث کا مفصل ذکر کرتا ہوں جو بعض اوقات واقع ہوتے ہیں، اور جنہیں ان جاہل لوگوں نے انکار خلق وخالق وعمد وتدبیر کا ذریعہ بنایا ہے۔ (یعنی کہتے ہیں اگر کوئی خالق ہے جس نے عالم کو خلق کیا ہے اور اس کی تدبیر اور بالقصد بنانے سے یہ عالم تیار ہوا ہے تو کیوں اس کی مخلوقات پر وقتاً فوقتاً آفتیں اور مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ وہ کیوں نہیں ان حادثات وغیرہ کو روکتا؟)

ان مکارہ ومصائب کو بھی، اسے مفصل بیان کروں گا جنہیں معطلہ اور مانویہ فرقے نے بالکل نہیں مانا ہے اور موت وفنا کا بھی ذکر کروں گا جسے اس فرقے نے ناپسندیدہ بات سمجھی ہے جو کچھ اصحاب طبائع (اطباء قدیم ودہریوں) نے کہا ہے اور جن لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ اشیائے عالم عرض واتفاق (از خود) سے پیدا ہوگئی ہیں۔ تاکہ ان کے کلام کے رد کرنے کے لیے یہ بیان کافی ہو سکے۔

''خدا انہیں قتل کرے کہاں بہکے چلے جاتے ہیں'' (القرآن الحکیم)

چند جاہل آدمیوں نے ان حوادث کو جو بعض اوقات واقع ہوتے ہیں، مثلاً وباء، یرقان (یا زرد بخار) (یا درختوں میں جو زردہ لگ جاتا ہے) اولے باری، ٹڈیاں، خلق وخالق وتدبیر کے انکار کا ذریعہ قائم کرلیا ہے۔ (کہتے ہیں کسی نے ان کو پیدا ہی نہیں کیا، کوئی ان کا خالق نہیں، کوئی حکمت صرف نہیں کی گئی)

اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اگر کوئی پیدا کرنے والا نہیں ہے کوئی مدبر

عالم نہیں ہے تو اس سے اور زیادہ سخت مصائب کیوں نہیں واقع ہوتے؟ مثلاً آسمان ہی زمین پر گر پڑے، زمین ہی دھنس جائے، آفتاب طلوع ہی نہ ہو، نہریں بالکل خشک ہو جائیں کہ ہونٹ تر کرنے کے لیے پانی ہی دستیاب نہ ہو سکے۔ ہوا ساکن ہو جائے، یہاں تک کہ تمام چیزیں فاسد و برباد ہو جائیں۔ سمندروں کا پانی زمین پر بہہ کر اسے غرق ہی کر دے۔ (ایسا کیوں نہیں ہوتا؟) کس نے روکا ہے، کون اس پردے میں ہے جس کی تدبیر چل رہی ہے؟ جب تم یہ کہتے ہو کہ اگر کوئی مدبر وخالق ہوتا تو اس قدر ٹڈیاں نہ آتیں اور ہمارا ایسا نقصان نہ ہوتا، اتنی وبا نہ پھیلتی جس سے ہماری لاکھوں جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔ اولے نہ پڑتے جن سے ہمارے غلے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، اگر واقعی یہ بات صحیح ہے تو آسمان ہی کیوں نہیں ایکبارگی پھٹ پڑتا جس سے تمام عالم فنا ہو جائے سمندر ہی یک مرتبہ کیوں نہیں ابل آتا جس سے تمام زمین تہہ آب ہو جائے، ہوا ہی کیوں نہیں ساکن ہو جاتی جس سے چند لمحوں میں تمام ذی روح مرجائیں، ایسا کیوں نہیں ہوتا؟

معلوم ہوا کہ نہیں، کوئی نہ کوئی اس عالم کا مدبر ومصلح موجود ہے جو ایسا نہیں ہونے دیتا۔ جس سے یہ مقصود ہے کہ تمام عالم فنا نہ ہو جائے نسل منقطع نہ ہو۔ واقعی تباہی نہ ہونے پائے۔ بلکہ صرف تنبیہ وتہدید وتخویف کی غرض سے یا خود ان کے اعمال کے نتائج سے کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ وباء پھیلتی ہے، ٹڈیاں آکر باغوں اور زراعتوں کو کھا لیتی ہیں، اولے باری ہو جاتی ہے، وغیرہ۔ اس سے یہ نہیں ثابت ہو سکتا کہ عالم کا کوئی مدبر ہی نہیں ہے۔

پھر میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ اگر یہ وباء اور ٹڈیاں ہمیشہ ہی کیوں نہیں رہتیں کہ تمام عالم ہی فنا ہو جاتا، بلکہ کبھی کبھی آجاتی ہیں، پھر ٹھہرتی نہیں بلکہ چلی جاتی ہیں۔ (اگر کوئی مدبر عالم اور اس کا خالق نہیں ہے جو یہ چاہتا ہے کہ تمام جہان تباہ و برباد نہ ہو تو کون ان

ٹڈیوں کو ہمیشہ زراعتوں پر ٹوٹ پڑنے سے روکتا ہے، آخر ہر سال ہر فصل میں یہ ٹڈیاں کیوں نہیں آتیں؟)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ ان تمام آفات و حوادثِ عظیمہ سے عالم کی حفاظت کی جاتی ہے۔ (آسمان نہیں پھٹ پڑتا، زمین نہیں دھنس جاتی، سمندر نہیں ابل پڑتے وغیرہ وغیرہ) کہ اگر ان میں سے کوئی بھی اس جہان میں واقع ہو جائے تو جہان بالکل نیست و نابود ہی ہو جائے، لیکن بعض اوقات معمولی سی یہ آفتیں آجاتی ہیں وہ بھی صرف آدمیوں کی تادیب و اصلاح کی غرض سے، پھر یہ نہیں ہوتا کہ قائم رہیں، بلکہ جس وقت انہیں اپنے بچاؤ سے یاس ہو جاتی ہے اسی وقت یہ بلائیں ان سے دفع ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا ان مصائب کا واقع ہونا ان کے لیے موعظہ ہے اور ان کا دفع ہو جانا ان کے لیے رحمت ہے۔

جس طرح مانو یہ فرقے نے ان مصائب و مکارہ کو ناپسندیدہ امر سمجھا ہے جو آدمیوں پر واقع ہوتے ہیں، اسی طرح معطلہ فرقے نے بھی ان مصائب کی حقیقت کو نہیں پہچانا اور انہیں فضول بتایا ہے۔ دونوں یہی کہتے ہیں کہ اگر عالم کا کوئی خالق، رؤف، رحیم ہوتا تو اس میں یہ ناپسندیدہ امور واقع ہی نہ ہوتے اس کلام کا قائل اسے اس طرف لے جاتا ہے کہ مناسب یہ تھا کہ انسان کی زندگی اس دنیا میں بے کھٹکے بے غم و رنج ہوتی۔

حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو انسان خود خود پسندی و سرکشی سے ایسی حالت میں ہو جاتا کہ وہ حالت نہ تو اس کے دین و مذہب کے لیے مناسب ہوتی اور نہ اس کی دنیا کے لیے جیسا کہ تم اکثر ناز پروردہ اور آسائش و امن میں نشونما پائے ہوئے لوگوں کو دیکھتے ہو کہ ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض تو (ایسے مدہوش اور سرکش ہو جاتے ہیں کہ) اپنا آدمی ہونا ہی بھول جاتے ہیں اور یہ کہ وہ کسی کے پروردہ ہیں بھی یا نہیں۔ (بلکہ غایت نخوت

سے اپنے تئیں واجب التعظیم سمجھنے لگتے ہیں جیسے تم نے اکثر بدمغز امراء و رؤساء کو دیکھا ہوگا، بلکہ بعض تو اپنے تئیں خدا ہی جاننے لگتے ہیں۔) کیا تمہیں اس کی مثالیں یاد نہیں؟ اور اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ آئندہ ان کو کوئی ضرر یا رنج و غم پہنچ سکتا ہے یا نہیں۔ یا کوئی دوسری بلائے ناگہانی بھی ان پر وارد ہو سکتی ہے اور یہ کہ انہیں کسی ضعیف و ناتواں پر رحم کرنا یا ہمدردی سے پیش آنا یا کسی فقیر و بیمار کی غم خواری و عیادت لازم ہے یا نہیں۔ یہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی مصیبت ان پر پڑتی ہے اور اس کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے تب بھی وقتی طور پر نصیحت پکڑتے ہیں اور بہت سی ایسی باتیں کرنے لگتے ہیں جن کا کرنا ان کے لیے (پہلے ہی سے) ضروری تھا۔ (اگر ان پر یہ مصائب نہ ڈالے جاتے تو اسی طرح خدا بنے رہتے، کبر و نخوت میں عمر بسر کرتے کسی پر رحم نہ کھاتے، کسی کی غمخواری نہ کرتے۔

تو کیا یہ سب کچھ ان کے دین و دنیا کے لیے مناسب تھا؟

ہرگز نہیں، بلکہ دین کے ساتھ دنیاوی خرابیاں بھی واقع ہوتیں کہ آخر کار لوگ ان سے نفرت کرنے لگتے اور درپے آزار ہو جاتے اور نیز ایسے ایسے خود پسند آدمیوں کے وجود سے صناعت، تجارت، علم، عمل، معاملات وغیرہ سب میں خلل واقع ہو جاتا۔ نظام عالم ہی دگرگوں ہو جاتا۔)

جو لوگ ان باتوں سے انکار کرتے ہیں، یا لغو سمجھتے ہیں۔ ان کی مثال (صاف) ان بچوں جیسی ہے جو کڑوی اور بدمزہ دواؤں سے نفرت کرتے اور نقصان دہ غذاؤں کے ضرر سے روکے جانے پر خفا ہوتے ہیں۔ ادب سیکھنے کو ناپسند اور لہو و لعب کو اچھا جانتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ لغویات ان کے لیے کس قدر نقصان دہ اور اخلاق و عادات میں کیا خرابی پیدا کر سکتے ہیں اور یہ لذائذ ان کی صحت کے لیے کس قدر ضرر رساں ثابت ہوں گی۔ علم سیکھنے میں ان کے لیے کیا بہبودی ہے۔ دواؤں میں کیا کیا فوائد ہیں وغیرہ وغیرہ۔

انسان گناہوں سے معصوم کیوں رکھا گیا:۔

اگر وہ (دہریے) یہ کہیں کہ پھر انسان گناہوں سے معصوم ہی کیوں نہ رکھا گیا کہ خدائے تعالیٰ کو اس بات کی ضرورت ہی نہ ہوتی کہ وہ ان کو مصائب سے دوچار کرے۔

جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ ایسی صورت میں نہ تو انسان نیکی کرنے پر قابلِ تعریف ہوتا اور وہ اس پر ثواب کا مستحق ہوتا۔ (کیونکہ آدمی قابل تعریف اور مستحق ثواب اسی وقت ہوتا ہے نہ کہ باوجود گناہوں پر قادر ہونے اور اس کے اسباب مہیا ہونے کے صرف پروردگار کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے ان گناہوں سے باز رہتا ہے۔ اگر اس میں گناہ کا مادہ ہی نہ ہوتا اور پھر وہ گناہ نہ کرتا تو اس کی تعریف کی کیا تھی؟)

پھر اگر وہ یہ کہیں کہ اس کا انتہائی لذت و آسائش پر پہنچنے کے بعد نقصان ہی کیا ہوتا جو نیکی کرنے سے قابل تعریف سمجھا جاتا اور ثواب کا مستحق نہ ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ (اس بات کو) کسی صحیح العقل اور صحیح الجسم آدمی کے سامنے پیش کرو کہ آرام سے بیٹھا رہے اور اس کی تمام ضرورت بغیر کوشش و استحقاق کے اس کو ملتی رہے۔ پھر دیکھو کہ اسے اس کا دل قبول کرتا ہے (یا نہیں۔ ہرگز قبول نہیں کرے گا) بلکہ تم اسے ایسا پاؤ گے کہ تھوڑی سی چیز جو اس کی حرکت اور کوشش سے ملے گی، اس کے لیے زیادہ باعث خوشی و سرور ہوگی، بہ نسبت اس بہت سی شئے کے جو سعی و کوشش اور بلا استحقاق حاصل ہو۔

علیٰ ہذا القیاس، آخرت کی نعمتیں بھی ان لوگوں کے نزدیک اسی وقت کامل و حاصل ہوں گی جب کہ انہیں کوشش کے بعد پائیں۔

لہٰذا انسان کو اس بارے میں دو قسم کی نعمتیں دی گئی ہیں۔

(۱) یہ کہ اس دنیا میں اس کی جدوجہد پر بہت سا ثواب مہیا کیا گیا ہے۔

(۲) یہ کہ اس کو یہ راہ بتا دی گئی ہے کہ اسے سعی و کوشش سے حاصل کرے تاکہ جو چیز بھی اس کو ملے اس سے پوری پوری خوشی و سرور حاصل ہو۔

(یہ ایک قدرتی بات ہے کہ آدمی جو چیز بغیر کوشش اور بلا استحقاق پاتا ہے اس کی قدر و قیمت کو نہیں جانتا، برخلاف اس کے سعی و کوشش کے بعد میسر ہو۔

لہٰذا خدائے تعالیٰ کی نعمتیں جو انسان کو گناہوں سے باز رہنے اور اپنے پر باوجود قدرت و طاقت کے جبر کرنے کی وجہ سے ملیں وہ اس کے نزدیک زیادہ قابل وقعت ہوں گی، بہ نسبت اس کے کہ اس کو اپنے نفس کشی کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور از خود ہی وہ ایسا ہوتا کہ کسی ناجائز چیز کی طرف رغبت ہی نہ کرتا، پھر اسے خدائے تعالیٰ کی نعمتیں، آخرت میں دی جاتیں تو اسے کچھ قدر نہ ہوتی۔

پھر اگر وہ کہیں، کہ، کیا ایسا نہیں ہوتا کہ بعض آدمی (بفرض عدم عصمت) بے استحقاق بھی کسی اچھی چیز کے حاصل کرنے پر خوش ہو جاتے ہیں تو ان لوگوں پر کیا حجت ہوگی جو اسی طرح (بغیر سعی و کوشش ہی) نعیم آخرت کے دستیاب ہو جانے پر خوش اور راضی ہوں؟

انہیں یہ جواب دیا جائے گا کہ ایسا مضمون ہے کہا گر لوگوں کو (بفرض عدم عصمت) اسی بات کا یقین ہو جائے کہ ہمیں بغیر مشقت (بغیر عبادت و اطاعت) نعیم آخرت مل جائے گی تو نہایت ہی جرات اور دلیری سے فواحش اور محرمات کرنے لگتے، پھر کون ایسا ہوتا جو اپنے نفس کو فواحش سے روکتا، یا امور خیر میں سے کسی امر خیر کے لیے مشقت برداشت کرتا، جب کہ اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں تو لامحالہ نعیم آخرت پاؤں گا ہی (خواہ نیکی کروں یا برائی کا مرتکب ہوں) یا کسے اپنی جان، اپنے مال، اپنے عیال پر اطمینان ہو سکتا کہ لوگ انہیں نقصان نہ پہنچائیں گے جب کہ ان کو حساب و عقاب کا خوف ہی نہ ہوتا۔ (ظاہر ہے کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ہم چاہے برائی کریں یا بھلائی جنت میں ضرور جائیں گے تو

انہیں کسی کے مال وعیال و جان کے نقصان پہنچانے میں کیا باک ہوتا اور پھر کسی ایک کو دوسرے سے اطمینان ہی کب ہوسکتا تھا کہ یہ ہمیں نہ ستائے گا۔) تو اس کا ضرر اس دنیا میں قبل از آخرت تمام لوگوں کو پہنچ جاتا، (دیکھتے تو سہی کتنی بڑی یہ تکلیف ہے کہ آدمی کسی وقت مطمئن بیٹھ ہی نہیں سکتا، اس سے بڑھ کر کیا ضرر ہوسکتا اور اس سے زیادہ کس چیز سے نظام عالم میں خلل پڑ سکتا تھا۔)

پھر تو اس میں عدل وحکمت دونوں ایک ساتھ ہی معطل ہو جاتے (اس لیے کہ جو برائی کرے وہ بھی نعیم آخرت پائے اور اچھائی کرے وہ بھی، تو پھر انصاف کہاں رہا۔) اور اس بے قاعدگی اور خلاف حکمت وصواب اور بے محل کام کی تدبیر پر طعن کرنے کا موقع ملتا (کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ صاحب کیا اچھی آپ کی فلاسفی ہے کہ ظالم ومظلوم، عاصی ومطیع، برہ وفاجر، سب ایک ہی جیسے سمجھے جارہے ہیں سب کو نعیم آخرت سے مستفیض کیا گیا ہے۔ اچھی تدبیر نکالی ہے۔

لہٰذا انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے کہ اس میں قوت معصیت اور قوت اطاعت و عبادت موجود ہے اور پھر عقل اور رسول کے ذریعے سے ہر چیز کی اچھائی اور برائی بھی سمجھا دی گئی، تاکہ اس کے باوجود خواہ وہ معصیت میں مبتلا ہو جائے اور فعل بد اور ترک عبادت کو نیک کام اور باعث خوشنودی خدائے تعالیٰ سمجھ کر عمل کرے یا افعال نیک انجام دے اور اطاعت خدا میں زندگی بسر کرے اور ابدی وسرمدی نعمتوں سے سرفراز ہو، ورنہ معصیت کے باعث مورد عذاب آخرت ہو، یہ دونوں ہی قسم کے کام اس کے اختیار اور عقل پر چھوڑے گئے ہیں، تاکہ سزا و جزا جس کے مطابق کام کرے اس کا فائدہ یا نقصان اس کے ذاتی فعل کا نتیجہ ٹھہرے۔)

مصائب وتکالیف، نیک وبد دونوں کے لیے کیوں ہیں؟

یہ (دہریے) ان مصائب وتکالیف پر بھی بحث کرتے ہیں جو (کبھی) عام طور پر واقع ہوتے ہیں کہ نیک وبد سب ہی ان میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یا نیک آدمی ہی مبتلا ہوتے ہیں اور بدکار بچ جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ حکیم مطلق کی تدبیر نے اس بات کو کیونکر جائز کیا (جب کہ تم کہتے ہو کہ عالم کو کسی مدبر حکیم نے پیدا کیا ہے) اور اس میں دلیل و حجت کیا ہے؟

ان کو جواب دیا جائے گا کہ یہ مصائب اگرچہ نیک وبد سب ہی پر پڑ جاتے ہیں مگر اس میں معبود حقیقی نے دونوں قسم کے آدمیوں کی بہتری قرار دی ہے، نیکوں کو جو مصائب و تکالیف پہنچتے ہیں تو ان کو وہ نعمتیں پھر مل جاتی ہیں جو اس سے پہلے تھیں جو ان کے صبر وشکر کا باعث ہوتی ہیں، اور بدکاروں کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ان کے طغیان وسرکشی کو توڑ دیتی ہے اور معصیتوں سے باز رکھنے اور فواحش ترک کرنے کے لیے ہوتی ہیں اور عبرت کے لیے بھی۔

علیٰ ہذا القیاس، ان دونوں قسم کے آدمیوں کے لیے مصائب سے بچ رہتے ہیں ان کے لیے بھی اس میں (برابر) صلاح وبہبودی قرار دی ہے۔ ابرار (نیکوکار) کے لیے تو اس وجہ سے کہ وہ جس حالتِ نیکی وصلاح میں ہیں اس پر خوش ہوتے ہیں اور زیادہ ان کو رغبت اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے (جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہم کو اللہ نے اس بلا سے محفوظ رکھا۔)

اور فجار کے لیے اس وجہ سے کہ وہ اپنے پروردگار کی مہربانی اور بخشش کو سمجھتے ہیں کہ بلا استحقاق ان کو اس مصیبت سے اس نے محفوظ رکھا۔ اس سے ان کو لوگوں کے ساتھ مہربانی کرنے اور جس نے ان سے کوئی برائی کی ہے اس سے درگزر کرنے پر آمادگی ہوتی ہے۔

شاید کوئی معترض یہ کہے کہ اس قسم کی بلائیں تو ان کے اموال پر واقع ہوتی ہیں لیکن پھر ان کے اجسام پر کیوں مصیبتیں ڈالی ہیں جن سے وہ تلف ہو جاتے ہیں؟ مثلاً کبھی جل جاتے ہیں، کبھی زمین میں دھنس جاتے ہیں۔

تو ان کو جواب دیا جائے گا کہ اس میں بھی خدائے تعالیٰ نے دونوں قسم (نیک و بد) کے آدمیوں کے لیے بہتری قرار دی ہے۔ مکروہات اور تکلیف سے نجات پا جاتے ہیں۔

اور فجار کے لیے اس سبب سے کہ ان کے بار گناہ کم ہو جاتے ہیں اور وہ مزید زیادہ سے زیادہ گناہ کرنے سے بچ جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خالق تعالیٰ ذکرہٗ اپنی حکمت وقدرت سے ان تمام امور کو خیر و منفعت ہی کی طرف پھیرتا ہے۔ جیسا کہ ہوا، جب کسی درخت کو توڑ دیتی ہے تو ایک کاریگر اسے مختلف طرح کے منافع میں صرف کر لیتا ہے۔ اسی طرح مدبر حکیم ان مصائب کو جو آدمیوں کے مال اور اجسام پر وارد ہوتے ہیں تمام انہیں کے فوائد ومنافع کی طرف مصرف کر دیتا ہے۔

پھر اگر کوئی یہ کہے آدمیوں پر یہ حوادث کیوں پڑتے ہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی طویل سلامتی کے باعث معصیت کی طرف مائل نہ ہوں، ایسا نہ ہو کہ بدکار لوگ تو خوب ہی معصیت کرنے لگیں اور نیکوکار کوشش کرنے میں سستی کریں۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں (یعنی فاجروں کا آرام کی وجہ سے معصیتوں میں مبتلا ہونا اور نیکوں کا، کار خیر میں سستی کرنے لگنا) ایک ساتھ ہی آدمیوں پر اس وقت غالب آجاتی ہیں جب کہ وہ عیش وآرام میں ہوتا ہے اور یہ حوادث ان کو (ان دونوں باتوں سے) روکتے رہتے ہیں اور ایسی چیزوں پر ان کو متنبہ کرتے ہیں جن میں ان کی ہی بہتری ہو۔ پس اگر

بالکل تکالیف سے خالی کر دیے جائیں تو حد سے زیادہ سرکشی اور معصیت میں مبتلا ہو جائیں۔ جیسا کہ گزشتہ زمانے کے لوگوں نے کیا، یہاں تک کہ ان کو طوفان کے ذریعے سے ہلاک کر دینا اور زمین کو ان سے پاک کر دینا ہی ضروری ہوا۔

ان منکرین عمد وتقدیر کے دل میں ایک بات سمائی ہوئی ہے اور وہ ہے مسئلہ موت و فنا، ان کا خیال یہ ہے کہ تمام آدمی ہمیشہ لے لیے زندہ رہتے، کسی پر کوئی آفت و بلا نہ آتی۔ (ان کے خیال میں مرنا تدبیر کے خلاف ہے، اس لیے کہہ دیا کہ اگر کوئی مدبر عالم (جس نے اس کی ساخت کو حکمت سے بنایا ہے) ہوتا تو کیوں آدمی مرتے۔

اب ضروری ہو گیا کہ اس امر کو انتہا تک پہنچا دیا جائے، اور پھر دیکھا جائے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

تم ہی دیکھو! کہ اگر تمام جہان کے آدمی ہمیشہ زندہ رہتے کوئی ان میں سے نہ مرتا، تو کیا زمین ان پر تنگ نہ ہو جاتی؟ یہاں تک کہ ان کو رہنے کے لیے مکان، زراعت کے لیے کھیت اور زندگی بسر کرنے کی تمام چیزیں نہ مل سکتیں، اس وقت باوجود یہ کہ موت ان کو فنا کر رہی ہے پھر بھی مساکن اور مزروعات کی بابت لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر سب آدمی زندہ رہتے تو اس وقت ان کا کیا حال ہوتا۔ (تو کیا اس وقت ایک چپہ بھر زمین بھی باقی رہ سکتی تھی جس میں یہ لوگ مکانات تعمیر کر سکتے تھے، زراعت کر سکتے تھے، آخر یہ تمام آدمی کہاں رہتے؟))

(۲) اور ان پر حرص وطمع وقساوت قلبی غالب آجاتی، (کیونکہ مرنے کا خوف تو ہے ہی نہیں، باز پرس کا بھی خیال نہیں، پھر کیوں نہ حرص وطمع وقساوت غالب ہوگی۔) پس اگر ان کو یہ اطمینان ہو جاتا کہ اب ہم مریں ہی گے نہیں، تو کوئی شخص کسی ایک چیز کے پا لینے پر قناعت نہ کرتا۔ (بلکہ زیادتی واضافہ کی خواہش رکھتا) اور نہ

کسی مانگنے والے کو کوئی چیز دینی گوارا کرتا اور نہ کسی حادثے اور واقعے کے پڑنے کے بعد تسلی ہوتی۔ (اب تو یہ ہے کہ چونکہ اپنے ہی مرنے کا خیال لگا ہوا ہے، اس وجہ سے کسی حادثے کا چنداں اثر نہیں ہوتا جس سے تسلی ہی نہ ہو سکے)

(۳) ایسی زندگی سے اور نیز امور دنیا سے تنگ آجاتے جب کہ وہ شخص جس کی عمر طولانی ہو جاتی ہے اپنی زندگی سے تنگ آکر موت کی تمنا کرنے لگتا ہے اور دنیا سے راحت چاہتا ہے۔

پس اگر وہ یہ کہیں (یعنی دہریے یہ کہیں) کہ (اس صورت میں) چاہیے تھا ان سے تمام مکروہات اور بیماریاں اٹھا دی جاتیں تاکہ موت کی آرزو نہ کرتے اور نہ اس کے مشتاق ہوتے۔ (اب تو صرف بڑھاپے اور بیماریوں کی وجہ سے موت کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔) تو (اس کا جواب وہی ہے) جو ہم نے بیان کر دیا کہ پھر تو وہ سرکشی اور تمردی میں پڑ جاتے جو انہیں ایسے امور پر آمادہ کرتی جس سے دین و دنیا دونوں میں خرابی پڑتی۔

اور اگر وہ (دہریے) یہ کہیں کہ ان کی نسل ہی نہ بڑھتی تاکہ مساکن ومعاش کی تنگی نہ ہوتی؟

جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اس قدر مخلوقات عالم میں داخل نہ ہوتے اور خدائے تعالیٰ کی نعمتوں اور بخششوں سے دونوں جہان میں محروم رہ جاتے جب کہ عالم میں سوائے ایک قرن کے دوسرا داخل ہی نہ ہوتا اور نہ ان میں توالد وتناسل ہوتا۔ حالانکہ قانون انصاف بلکہ قانون اختیار وکمال ذات کے بالکل برخلاف ہے کہ صرف ایک ہی قرن کے پیدا کرنے پر، پروردگار عالم اکتفاء کرتا اور آئندہ نسلوں کو جن کا پیدا ہونا ممکن ہے، نہ پیدا کرتا تو آئندہ نسل والے اس کے کمال کے فیوض سے بالکل محروم رہتے۔ (دیکھو فلسفہ ابتدائے خلق۔ یہ بڑا غامض اور لطیف مسئلہ ہے۔)

پھر اگر وہ کہیں کہ جس قدر انسان آئندہ پیدا کرے گا اور کر چکا ان سب کو ایک ہی قرن میں پیدا کر دیتا، (تو وہ خرابی نہ ہوتی جو آپ نے بیان فرمائی ہے کہ اتنی مخلوقات خدا کی نعمتوں کے حاصل کرنے سے محروم رہتی۔)

جواباً یہ کہا جائے گا پھر تو وہی پہلی بات لازم آتی جو ہم نے بیان کر دی ہے کہ ان کو رہنے سہنے کے لیے مکانات اور زندگی بسر کرنے کی تنگی ہوتی (کہاں روئے زمین پر اتنی جگہ ملتی کہ اتنے بے شمار آدمی اس میں مکان بنا سکتے زراعت کر سکتے یا چل پھر سکتے۔) پھر اگر (ایک ہی مرتبہ اول سے آخر تک کے آدمی پیدا کر دیے گئے ہوتے اور) ان میں توالد وتناسل نہ ہوتا تو وہ دلچسپی جو قرابت اور قرابت داروں سے حاصل ہوتی ہے، جاتی رہتی اور سختی وشدت کے موقع پر کس سے مدد لی جاتی، بچوں کی پرورش میں جو کیفیت اور سرور حاصل ہوتا ہے وہ کہاں سے ملتا، اور تو اگر توالد وتناسل نہ ہوتا تو پھر یہ آئندہ نسل کس سرزمین پر جا کر آباد ہوتی جب کہ ما قبل نسلوں کے لیے یہ زمین کفایت نہیں کر سکتی)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکمت وتدبیر کے خلاف جس طرف بھی خیالات جاتے ہیں سب غلط ہیں اور حماقت ولغو ہیں۔

جزا وسزا کی تقسیم میں اللہ کی مصلحتیں:۔

شاید کوئی معترض ایک اور رخ سے اس تدبیر پر اعتراض کرے اور کہے کہ کیونکر معلوم ہو کہ عالم میں کوئی مدبر وخالق بھی ہے، حالانکہ ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جو آدمی غالب ہوا اسی نے اپنے کمزور مد مقابل پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔ قوی تو ظلم کرتا ہے مال دنیا غصب کرتا ہے، اور کمزور وعاجز مظلوم رہتا ہے، ذلیل وخوار ہوتا ہے، نیک آدمی فقیر اور بلاؤں میں مبتلا رہتا ہے، اور فاسق وفاجر شخص نہایت خوش حال اور تندرست رہتا ہے جو کوئی بدی یا ہتک حرمت کرتا ہے اسے جلد سزا نہیں ملتی، لہذا معلوم ہوا کہ اگر کوئی عالم میں کوئی

تدبیر ہوتی (یعنی کوئی مدبر عالم ہوتا جس کی کاروائی اور تدبیر اس عالم میں کارفرما ہوتی) تو
باقاعدہ کام ہوا کرتے، نیکوں کو بہتر روزی ملتی، بدوں کو محروم رکھا جاتا۔ قوی کو ضعیف پر ظلم
کرنے سے باز رکھا جاتا، حرام کاروں کو سزا مل جاتی۔

اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو نیکوکاری کی قدر جاتی
رہتی۔ جس سے خاص طور پر انسان ہی کو فضیلت دی گئی ہے۔ باقی مخلوقات میں یہ صفت نہیں
ہے اور نیکی و عمل خیر پر محض ثواب معبود حقیقی کے وعدوں پر بھروسہ کر کے اپنے نفس کو آمادہ
کرنے کی کچھ وقعت ہی نہ ہوتی۔ (اس لیے کہ جب مجبور کر کے پروردگار عالم لوگوں سے
کام لیتا کہ قوی آدمی ضعیف پر ظلم نہ کر سکے، نیکوں ہی کو روزی اور دیگر نعمتوں سے سرفراز کیا
جائے، بدوں کو ان تمام نعمات سے محروم رکھا جائے۔ تو پھر عمل خیر پر ثواب ہی کس لیے دیا
جاتا اور انسان کس پر بھروسہ کرتا) اور پھر......

(۱) تمام آدمی مثل چوپاؤں کے ہو جاتے جن کی سیاست عصا اور علف (یعنی لاٹھی
ڈنڈے) کے ذریعہ سے کی جاتی ہے کہ ہر دم، کبھی تو ان کو چھری دکھائی جاتی ہے
کبھی چارہ کھایا جاتا ہے، تب وہ صحیح رہتے ہیں (اسی طرح اگر آدمیوں کا بھی
انتظام من جانب اللہ ہوتا تو ان میں اور حیوانات میں کیا فرق رہ جاتا۔)

(۲) نیز، عذاب و ثواب کا مرحلہ ہی ختم ہو جاتا، پھر انسان کی خلقت ہی لغو و بے کار ہو
جاتی اور کوئی شخص ثواب وعقاب کا یقین کر کے کوئی عمل ہی نہ کرتا، انسان اپنی
انسانیت کا لبادہ اتار کر بہائم بن جاتے۔

(۳) پھر یہ کہ کوئی شخص نعمات غائبہ (نعمات آخرت) کو جانتا ہی نہیں صرف موجود و
معلوم کی بنا پر کام کرتا، (جب یہ دیکھتا کہ اگر میں ظلم کروں گا تو ابھی بدلہ پاؤں گا،
اور اگر نیک کام کروں گا تو ابھی رفاہ اور فلاح حاصل ہو جائے گی تو سارے

ثواب و جزا کا خاتمہ اسی دنیا کی موجودہ حالت پر ہو جاتا اور نعیم ابدی و حیات
سرمدی کا کسی کو خیال بھی پیدا نہ ہوتا۔)

(۴) اس سے یہ بھی خرابی پیدا ہوتی کہ ایک نیکوکار، صرف اس لیے نیکی کرتا کہ اسے
روزی ملے، اسی دنیا میں وسعت ہو، اور بدکار، ظلم اور فواحش سے صرف اس سبب
سے گریز کرتا کہ اس کے ارتکاب پر سزا پائے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے تمام
افعال صرف حاضر و معلوم (ثواب وعقاب دنیاوی) کی بنیاد پر واقع ہوتے۔
خدائے تعالیٰ نے جو ان کاموں میں ثواب و عذاب مقرر کیا ہے اس کے یقین کا
ایک شائبہ بھی ان کاموں میں نہ ہوتا، نہ وہ آخرت کے ثواب اور وہاں کی دائمی
نعمتوں کے مستحق ہی ہوتے۔

بایں ہمہ اس معترض نے جس فقیری و توانگری، تندرستی و بلا کا ذکر کیا ہے بالکل
خلاف قیاس ہی نہیں ہے، بلکہ ایسا بھی واقع ہوتا ہے اور جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا بھی ہوتا
ہے، تم دیکھتے ہو کہ اکثر نیکوکاروں کو مختلف تدبیروں سے دولت بھی حاصل ہوتی ہے، اس
لیے کہ ایسا نہ ہو، لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ کافروں کو روزی وغیرہ ملتی ہے،
اور نیکوکار محروم رہتے ہیں، تو سب لوگ بدکاری ہی اختیار کر لیں نیکی کریں ہی نہیں۔

نیز، تم دیکھتے ہو کہ فاسقوں کو اس دنیا میں بھی سزا مل جاتی ہے جب کہ ان کی
سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے اور لوگوں کو اور خود ان کو ان سے زیادہ نقصان پہنچنے لگتا ہے جیسا
کہ فرعون کو غرق کر دیا گیا، بخت النصر کو مسخ کر دیا گیا اور بلبیس کو قتل کیا گیا وغیرہ۔

اور اگر کسی ایسی مصلحت سے جسے بندے نہیں جانتے بعض شریروں کو سزا دینے
میں مہلت و تاخیر دی گئی یا بعض نیکوکاروں کی جزا کلیۃً آخرت پر رکھ چھوڑی گئی تو اس سے
تدبیر تو باطل نہیں ہوتی (کہ کسی کو جلد سزا دے دی گئی، کسی کو دیر سے، کسی کو اس کے اچھے کام

کا جلد ہی عوض و انعام دے دیا جاتا ہے، کسی کو مصلحت اندیشی کے سبب تاخیر میں دیا جاتا ہے۔) مگر اس سے ان کی تدبیر میں تو خلل واقع نہیں ہوتا، بلکہ جن کاموں میں انہوں نے تاخیر یا تعجیل کی ہے اسے تدبیر کے موافق اور صائب رائے کی بنا پر کیا گیا ہے، جب کہ شواہد شہادت دے رہے ہیں اور ان کا قیاس (قانونِ عقل) واجب کر رہا ہے کہ اشیائے عالم کا کوئی نہ کوئی ضرور خالق و مدبر ہونا چاہیے تو اب پھر ان کی تدبیر و اصلاح سے کیا چیز مانع ہے کیونکہ انسانی قیاس ہرگز نہیں سمجھتا کہ کسی چیز کا صانع ہو وہ اپنی مصنوع کو یونہی مہمل چھوڑ دے۔ البتہ عجز یا جہالت و شرارت سے تو چھوڑ سکتا ہے۔ مگر یہ باتیں خدائے تعالیٰ کی صنعت میں نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ عجز، جہالت یا شرارت اس کے لیے محال ہیں (نہ خدائے تعالیٰ اپنی مخلوقات کی اصلاح سے عاجز ہے، نہ اسے اپنے مخلوقات کے حال سے جہالت ہے اور نہ معاذ اللہ اس میں شر و فساد ہے۔)

(اور یہ عجز و جہل و شر کی وجہ اصلاح و تدبیر نہ کرنا) اس سبب سے ہے کہ عاجز تو اس بات پر قادر ہی نہیں کہ ایسے ایسے عجیب و جلیل و بزرگ مخلوقات عجیبہ پیدا کر سکے اور جاہل کو راستی و حکمت کا راستہ ہی نہیں ہوتا۔ شریر شخص ایسی مخلوقات و نفیسہ پیدا ہی کیوں کرے گا۔

اور جب یہ بات اس طرح قائم ہوئی (جو ہم نے بیان کی کہ عدم اصلاح اور تدبیر صرف و عجز و شرارت سے ہوتی ہے اور خالق عالم ان تینوں باتوں سے پاک ہے) تو لازم ہوا کہ ان مخلوقات کا خالق لامحالہ ان کی تدبیر و اصلاح کرے۔ اگرچہ اس تدبیر کی حقیقت اور راہ لوگوں کو نہ معلوم ہو سکے، کیونکہ اکثر بادشاہوں کی تدبیروں کو بھی تو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس کے اسباب کو جانتے ہیں اور جب جان لیتے ہیں تو اسے بالکل صحیح اور ٹھیک پاتے ہیں اور اس کی دلیل امتحان ہے (آزمائش کر لو اور امتحان کر لو)

اور اگر تم کو کسی دوا غذا میں شبہہ ہو اور دو یا تین طرح سے (مثلاً ثابت ہو جائے

کہ یہ حار ہے (گرم مزاج ہے) یا بارد (ٹھنڈا مزاج ہے۔)

کیا تم اس تجربے سے بھی حکم نہ لگاؤ گے اور کیا اپنے شبہہ کو (جو اس میں پیدا ہوا تھا اب بھی) اپنے دل سے نہ نکالو گے؟ تو پھر یہاں کیوں نہیں تجربے سے کام لیتے اور کیوں نہیں سمجھتے کہ جو کچھ پروردگار عالم کرتا ہے وہ عین مصلحت مخلوقات کے واسطے ہے۔)

پھر ان جاہلوں (دہریوں) کا کیا حال ہے کہ باوجود اتنے کثیر شواہد کے جو اپنی زیادتی کے سبب شمار بھی نہیں ہو سکتے۔ جہان کے لیے خالق و مدبر کے قائل نہیں ہوتے۔ (میں تو کہتا ہوں کہ) آدھا جہان اور جو کچھ اس کے اندر ہے ایسا ہوتا کہ بظاہر اس میں راستی و درستی نہ پائی جاتی تب بھی عقل و علم کی شان نہ تھی کہ اس عالم کے اہمال (از خود پیدا ہونا) کے قائل ہوتے (چہ جائیکہ اس جہان کی تمام چیزیں حکمت و تدبیر سے مملو (پر ہیں) ہیں۔ اس پر یہ لوگ اس کا کوئی خالق ہی نہیں مانتے، اہمال ہی کے قائل ہیں) اس لیے کہ اس دوسرے آدھے میں تو ایسی درستی و استحکام ہے جو فوراً ایسی بات (بغیر خالق کے پیدا ہو جانا) کہنے سے روکتا ہے۔

تو اب کیونکر یہ بات کہی جا سکتی ہے جب کہ تفتیش و غور و فکر سے دیکھا جائے تو اس کی تمام ہی چیزیں نہایت ہی صواب و درستی پر قائم ملیں گی۔ یہاں تک کہ کوئی ایسی چیز نہیں جو دل میں آتی ہو اور وہ مخلوقات الٰہیہ میں اس سے بہتر اور صحیح طور پر موجود نہ ہو (تم امتحان کر لو، جانچ لو، کسی چیز کو دل میں خیال کرو کہ جہان میں یہ بات نہیں مگر جس وقت تم تلاش کرو گے ویسی ہی بلکہ اس سے بہتر تمہیں دکھائی دے گی حیوانات، نباتات، جمادات اور ان کے حالات و اوصاف و آثار و خواص کو ذرا عبرت کی نظر سے دیکھو تو پھر تمہیں اپنے خیال کی خود ہی آزمائش ہو جائے گی کہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط۔)

مفضل! اس بات کو معلوم کرو کہ یونانی زبان میں اس عالم کا مشہور و معروف نام

"قوسموس" ہے جس کے معنی "زینت" ہے اور اسی طرح فلاسفہ و مدعیان علم حکمت نے نام رکھا ہے۔ اسی سبب سے تو اس کا یہ نام رکھا ہے کہ اس کا نظام (صحیح و) باندازہ (صحیح) ہونا پایا ہے۔ تو پھر اس کا نام تقدیر و نظام ہی کیوں نہ رکھا، کہ قوسموس (زینت) نام رکھا تا کہ اس بات کو ظاہر کریں کہ اس عالم میں جو صواب و اتفاق ہے وہ نہایت ہی حسن و بہا پر قائم ہے۔

مفضل! مجھے ایسے لوگوں سے (سخت) تعجب ہوتا ہے کہ فن طب کی غلطی کے تو قائل نہیں ہوتے ہیں باوجودیکہ طبیب کی غلطیاں دیکھتے ہیں اور عالم کی اہمال کے قائل ہوتے ہیں حالانکہ اس کی کوئی چیز مہمل نہیں دیکھتے۔ بلکہ مدعیان حکمت کے اخلاق سے مجھ کو تعجب ہوتا ہے کہ خلقت کی حکمت کو جانتے نہیں اور خالق جل شانہٗ کی مذمت میں زبان درازی کرتے ہیں، بلکہ اس گمراہ مانی سے تعجب ہے کہ اسرار علم کی واقفیت کا دعویٰ کرتا ہے اور خلقت کے دلائل حکمت سے ناواقف ہے، کہتا ہے کہ اس خلقت میں غلطی و خطا ہے اور خالق تبارک و تعالیٰ کو جاہل بتاتا ہے۔

اللہ کی ذات عقل و ادراک سے بالاتر ہے:۔

ان سب سے زیادہ تعجب تو ان معطلہ فرقے والوں پر ہے جو اس بات کے خواستگار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو آنکھ سے دیکھ لیں جو عقل سے بھی نہیں معلوم ہو سکتا اور جب یہ ممکن نہ ہوا تو انکار ہی کر بیٹھے (کہ عالم کا کوئی خالق نہیں) اور کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتا، عقل میں یہ بات کیوں نہیں آتی؟

(بھائی اس کا جواب تو یہ ہے) کہ وہ مرتبہ عقل کی رسائی سے بالاتر ہے۔ (اس لیے تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتا۔) جیسا کہ آنکھ ان چیزوں کو نہیں دیکھ سکتی جو اس کی طاقت سے باہر ہیں۔ (اسی طرح عقل بھی اس شئے کو نہیں سمجھ سکتی جو ادراک عقل سے بالاتر ہے) اس سے مراد حضرت کی حقیقت ذات خدائے تعالیٰ کا علم ہے جو انسانی عقل میں نہیں آسکتا

اور یہ کہ اس کے وجود کا بھی علم محال ہے۔ آخر اتنے موجودات و عجائبات عالم اس کے وجود ہی کے تو دلائل و شواہد ہیں۔

مثلاً، اگر تم کسی پتھر کو ہوا میں اڑتا ہوا دیکھو، تو ضرور جان لو گے کہ اسے کسی پھینکنے والے نے پھینکا ہے۔ یہ بات آنکھ سے تو سمجھ میں نہیں آسکتی بلکہ عقل سے ادراک میں آئی، کیونکہ عقل ہی اس بات کی تمیز کرتی اور جانتی ہے کہ پتھر خود بخود ہوا میں نہیں اڑ سکتا۔ دیکھو تو سہی کہ نظر اس حد پر آکر ٹھہر گئی اور آگے نہ بڑھ سکی (یعنی نظر نے اس بات کا ادراک نہیں کیا کہ اس پتھر کا کوئی پھینکنے والا ہے، بلکہ عقل نے اسے سمجھا، آنکھ نے صرف پتھر کو اوپر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔)

علیٰ ہذاالقیاس، عقل بھی معرفت خالق عالم میں اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتی، لیکن ہم کہتے ہیں کہ جس عقل نے یہ سمجھا ہے کہ مجھ میں نفس اور جان ہے، حالانکہ نفس کو دیکھا نہیں اور نہ کسی دوسرے حاسے نے محسوس ہی کیا، وہی عقل خالق کو اس طور پر پہچانتی اور جانتی ہے جس سے اس کو (وجود خالق) کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور اس طور پر نہیں معلوم کر سکتی کہ اس کے تمام صفات کا ادراک کرے (جیسے اپنی روح اور اپنے نفس کی حقیقت کا کوئی شخص پورا پورا ادراک نہیں کر سکتا کہ وہ کیا ہے، کس چیز سے بنا ہے؟ البتہ اتنا جانتا ہے کہ مجھ میں روح ہے، مگر یہ کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اس کا علم نہیں ہو سکتا۔)

اب اگر وہ یہ کہیں کہ بندہ ضعیف کو اس نے اس بات کا مکلف ہی کیوں کیا کہ عقل لطیف سے اس کی معرفت حاصل کرے، حالانکہ وہ پورے طور پر اسے نہیں پہچان سکتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بندوں کو معرفت حاصل کرنے کی اسی قدر تکلیف دی گئی ہے جس قدر ان کے امکان میں ہے اور جہاں تک پہنچنے کی ان کو طاقت ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کے وجود ذی جود کا یقین کریں، اس کے اوامر و نواہی پر عمل کریں، انہیں یہ تو تکلیف نہیں

دی گئی کہ اس صفات (اور ذات) پر احاطہ حاصل کرلیں۔

چنانچہ کوئی بادشاہ اپنی رعایا کو اس بات کے جاننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ وہ جانیں کہ بادشاہ بلند قامت یا پست قد ہے، گورا ہے یا گندمی رنگت کا ہے، صرف اس بات کا ان کو مکلف کرتا ہے کہ اس کہ اطاعت کریں اور اس کے اصول پر عمل کریں۔

دیکھو! اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کے دروازے پر آکر یہ کہے کہ اپنے تیئں میرے سامنے پیش کرو، تاکہ میں تجھے اچھی طرح پہچان لوں، ورنہ تیرا حکم نہ مانوں گا، تو بے شک اس نے اپنے تیئں کو سزا دلوائی (لامحالہ اس جرأت پر بادشاہ اس کو سزا دے گا۔) اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں تو خالق کے وجود کا اقرار ہی نہ کروں گا، جب تک اس کی رویت نہ ہو جائے اور اس کی کنہ اور حقیقت کو معلوم نہ کرلوں گا، تو وہ خدائے تعالیٰ کو اپنے سے ناراض کرتا ہے۔

اگر وہ یہ اعتراض کریں کہ آخر تم اس کے صفات تو بیان کرتے ہو کہ اللہ جواد ہے، حکیم ہے، کریم ہے، عزیز ہے وغیرہ؟

تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ صفات اقرار ہیں (یعنی یہ وہ صفات ہیں جن کا اقرار ہم کو لازم ہے۔) صفات احاطہ نہیں ہیں، کیونکہ ہم اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ وہ حکیم ہے، لیکن ہم اس کی کنہ کو نہیں جانتے (کہ کس طرح کا حکیم ہے؟ یہ صفت اس میں کس طور پر ہے اس صفت کی اس کی ذات میں کیا ماہیت ہے) اسی طرح قدیر و جواد وغیرہ صفات ہیں، جیسا کہ ہم لوگ آسمان کو دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ اس کا مادہ کیا ہے، کس چیز سے بنا ہے اور دریا کو دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ اس کی انتہا کہاں تک ہے، بلکہ خدائے تعالیٰ تو ان تمام مثالوں سے بھی بے انتہا بالاتر ہے۔ اس لیے تمام مثالیں اس کی مثال بننے سے قاصر ہیں، البتہ اتنا ہے کہ عقل کو اس کی معرفت کی طرف لے جاتی ہیں۔ (اور رہبری

بھی کرتی ہیں)

اب اگر وہ یہ کہیں کہ پھر اس میں اختلاف ہی کیوں ہے؟

ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ خیالات اس کی عظمت کی حد تک نہیں پہنچ سکتے اور اس کی معرفت کے حاصل کرنے میں اپنی مقدار سے زیادہ تعدی کرتے ہیں، اس (خدا) کی پوری حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ اس سے (بلکہ) اس سے کم درجہ سے بھی عاجز ہیں۔

اس کی مثال آفتاب ہے جسے تم دیکھتے ہو کہ تمام جہان پر اپنی روشنی ڈالتا ہے حالانکہ اس کی حقیقت کسی کو بھی نہیں معلوم ہوئی (تو جب ایک معمولی مخلوق (آفتاب) کی حقیقت و ماہیت نہیں معلوم ہو سکتی تو بھلا خالق کی حقیقت کو کوئی کیوں کر جان سکتا ہے؟) اسی وجہ سے اس کی بابت بہت سے قول ہیں اور فلسفیوں نے اس بیان میں اختلاف کیے ہیں، کسی نے تو یہ کہہ دیا کہ وہ ایک فلکی جسم خولدار ہے جو آگ سے بھرا ہوا ہے اس میں منہ ہے جس سے روشنی پھیلتی اور شعاعیں نکلتی ہیں۔

کچھ لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ وہ ایک ابر (سفید) ہے۔

کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ ایک شیشہ سے مشابہہ جسم ہے، ناریت عالم کو قبول کرتا ہے اور پھر اسی ناریت کی شعاعیں عالم پر ڈالتا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال و عقیدہ ہے کہ وہ ایک صاف و شفاف و لطیف شئے ہے، پانی بستہ ہو کر (جم کر) بنا ہے۔

کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ آگ کے بہت سے اجزا ہیں جو ایک مقام پر مجتمع ہو گئے ہیں۔

کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ عناصر اربعہ کے علاوہ یہ ایک اور ہی پانچواں عنصر

ہے۔

پھر یہ بھی کہ ان لوگوں نے اس کی شکل (ہیئت) میں بھی اختلاف کیا ہے۔

☆ بعض کہتے ہیں کہ یہ بمنزلہ ایک چوڑے صفحے کے ہے۔

☆ دوسروں نے یہ رائے دی ہے کہ آفتاب مثل ایک گیند کے ہے۔

☆ علیٰ ہذا القیاس اس کی مقدار میں اختلاف کیا ہے۔

☆ کسی کا تو یہ دعویٰ ہے کہ آفتاب زمین کے برابر ہے۔

☆ دوسروں نے یہ کہا ہے کہ زمین سے چھوٹا ہے۔

☆ کسی نے یہ کہا ہے کہ اس جزیرہ عظیمہ (غالباً زمین مراد ہے) سے بڑا ہے۔

☆ علم ہندسہ والوں نے کہا ہے کہ آفتاب بہ نسبت زمین کے ایک سو ستر (۱۷۰) درجے بڑا ہے۔

ان کے اس (قدر) اختلاف اقوال سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ لوگ اس کی واقفیت اور حقیقت امر پر واقف نہیں ہوئے اور جب کہ اس آفتاب کی حقیقت معلوم کرنے سے عقلیں عاجز رہیں جسے آنکھیں بسا اوقات دیکھتی ہیں اور عقل اسے ادراک کرتی ہے تو اسے کیونکر محسوس کر سکتے اور سمجھ سکتے ہیں جب کہ جو چیز جس سے محسوس ہی نہیں ہو سکتی اور وہم وخیال سے مخفی و مستتر ہے۔

پھر اگر کہیں کہ آخر کیوں مخفی و پوشیدہ ہے؟

ان کو یہ جواب دیا جائے گا وہ کسی تدبیر و حیلے سے مخفی نہیں ہوا، وہ اس طرح پوشیدہ ہو جانے کے لیے مستتر ہوتا ہے، بلکہ ہم جو کہتے ہیں کہ وہ (خدائے تعالیٰ) نگاہوں سے نہیں ہے جیسے کوئی دروازوں اور پردوں کے پیچھے آدمیوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تک وہم وخیال نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ان کے ادراک سے زیادہ لطیف

ہے (جیسے نفس (نفسِ ناطقہ، روح) لطیف ہے (اور اسی لطافت کی وجہ سے آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتی،) ہوا بھی لطیف ہے جو محسوس ہوتی ہے لیکن آنکھ کی بینائی اسے دیکھنے سے قاصر و عاجز ہے) حالانکہ یہ سب چیزیں مخلوقات خداوندی میں سے ہیں پھر بھی وہم و خیال کے ادراک سے بالاتر ہیں (جس خالق کی مخلوق ادراک انسانی سے بالاتر ہو بھلا وہ خود کسی کے وہم وخیال میں کیسے آ سکتا ہے؟)

اب اگر وہ کہیں کہ وہ لطیف ہی کیوں ہے، حالانکہ وہ اس سے زیادہ بالاتر ہے؟

یہ سوال نہایت ہی غلط ہوگا، کیونکہ جو خدا تمام اشیاء کا خالق ہے اس کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ہر شئے سے مبائن و مغائر (غیر) ہو اور ہر چیز سے بالاتر ہو۔

''سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالیٰ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ''

اب اگر وہ یہ کہیں کہ اس کا مبائن و بالاتر ہونا تمام اشیاء سے کیونکر معلوم ہوا؟

تو ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ کسی شئے کے معلوم کرنے کا حق چار طریقوں سے پورا ہوتا ہے۔

(۱) یہ کہ دیکھا جائے، آیا وہ شے موجود ہے یا موجود نہیں ہے؟

(۲) یہ معلوم کیا جائے کہ وہ شئے فی نفسه و فی حد ذاته کیا چیز ہے؟

(۳) یہ کہ وہ شئے کیونکر ہے اور اس کی صفت کیا ہے؟

(۴) یہ معلوم کیا جائے کہ وہ کس وجہ اور کس سبب سے ہے؟

ان چاروں باتوں میں کوئی ایسی نہیں ہے جس کو کوئی مخلوق اپنے خالق کے متعلق پورے طور پر معلوم کر سکے۔ سوائے اس کے کہ اس قدر جان لے کہ وہ موجود ہے، بس (اور اس سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا کہ خدائے تعالیٰ کیا چیز ہے۔)

اب اگر ہم یہ کہیں کہ وہ کیونکر ہے اور کیا چیز ہے؟ تو اس کی کن کا جاننا اور اسے

کامل طور پر سمجھنا محال ہے، لیکن یہ کہنا کہ کیوں اور کس سبب سے ہے؟ تو یہ سوال خدائے تعالیٰ کی صفت میں بالکل ساقط (اور غلط ہے) اس سبب سے کہ وہ جل شانہٗ ہر چیز کی علت ہے اور اس کا سبب بھی ہے۔ کوئی اور شئے اس کی علت اور سبب نہیں ہے، (بھلا اس میں کیوں اور کس طرح کو کیا داخل ہوسکتا ہے۔)

جب آدمیوں نے اس قدر معلوم کرلیا ہے کہ وہ (خدائے تعالیٰ) موجود ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ یہ بھی جان لیں کہ وہ کیا چیز ہے اور کیوں ہے نفس وروح کا جاننا اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے کہ وہ کیا چیز ہے، اور کیونکر ہے (کیونکہ ہر شخص اس بات کو جانتا ہے کہ ہم میں روح ونفس موجود ہے۔ مگر آج تک کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ نفس وروح کی حقیقت کیا ہے، اس کی واقعی کیفیت کیا ہے۔)

علیٰ ہذا القیاس، دیگر روحانی لطیف اشیاء ہیں۔ (کہ ان کا وجود تو معلوم ہے مگر حقیقت ان کی کسی نے اب تک نہ جانی، اسی طرح پروردگار عالم کا وجود تو معلوم ہو گیا مگر اس کی حقیقت نہیں معلوم ہوسکتی کیونکہ وہ کسی حاسے سے محسوس نہیں ہوسکتا۔)

پھر اگر وہ یہ کہیں کہ تم تو اس کی عدم معرفت (بہ سبب عدم علم کے) ایسا بیان کرتے ہو کہ گویا وہ ایک نامعلوم چیز ہے۔

تو ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ ایک راہ سے تو واقعی ایسا ہی ہے، (یعنی) جب کہ عقل اس کی کنہ وحقیقت کی معرفت اور واقفیت کا علم حاصل کرنا چاہے (تو ضرور وہ اس راہ سے بالکل نامعلوم ہے) اور دوسری راہ سے وہ ہر قریب سے بھی زیادہ قریب ہے جب کہ دلائل شافیہ کے ذریعے سے اس کے وجود پر استدلال کیا جائے گا (تو اس کا وجود ایسا ثابت ہے، گویا وہ ہمارے سامنے ہی موجود ہے اور واقعاً ہے بھی ایسا ہی) پس ایک جہت سے تو وہ واضح وروشن ہے اور کسی پر بھی مخفی نہیں ہے (علم من حیث الوجود) اور ایک جہت سے بالکل

غامض (ڈھکا یا ناقابل فہم) ہے کہ اسے کوئی بھی ادراک نہیں کرسکتا۔ (من حیث الحقیقۃ و الماہیۃ) یہی حال عقل کا بھی ہے کہ شواہد و دلائل سے اس کا وجود معلوم ہے مگر اس کی ذات (وحقیقت) مخفی ہے۔

مگر اصحاب طبائع (نیچری، جن کا مدار صرف ظاہری سائنس پر ہے) تو یہ کہتے ہیں کہ طبیعت کوئی ایسا فعل کرتی ہی نہیں جو بے معنی اور بے کار ہو اور نہ کسی ایسی چیز کو چھوڑتی ہے جس سے کسی چیز کا کامل ہونا فی حد ذاتہ و طبیعتہ ہوتا ہو۔

ان کا خیال ہے کہ امتحان (وتجربہ) اس پر شاہد ہے (کہ دراصل فاعل وخالقِ اشیاء طبیعت ہے اور وہی ہر چیز کو بطور اکمل پورا کردیتی ہے۔)

ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ کس نے طبیعت کو یہ حکمت اور تمام اشیاء کے حدود پر اطلاع بخشی ہے بغیر اس کے کہ کسی کام کے حدِ اعتدال و قابلیت سے قدم آگے نہ بڑھائے (اور جو کرے وہ بالکل باقاعدہ اور درست ہی ہوا کرے) حالانکہ، یہ ایک ایسی بات ہے کہ عقلوں کو بہت سے تجربوں کے بعد بھی نہیں حاصل ہوتی (اور طبیعت غیر مدرکہ نے بغیر کسی تجربے اور امتحان کے ایسے محکم ومنضبط وبا تدبیر وحکمت افعال کرنے شروع کر دیے، یہ بالکل ہی خلاف قیاس ہے۔)

پس اگر وہ کہیں طبیعت حکیم ہے اور ایسے افعال پر قادر ہے تو انہوں نے جس کا انکار کیا تھا اسے مان لیا، کیونکہ یہی تو خالق کی بھی صفت ہے (کہ وہ حکیم وقادر ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ اس کا نام طبیعت رکھتے ہیں اور ہم اس کو اللہ، معبود، حکیم اور قادر وغیرہ کہتے ہیں۔)

اور اگر وہ اس بات سے انکار کردیں (کہ طبیعت میں حکمت وقدرت پائی جاتی ہے۔) تو یہ حکیمانہ خلقت بلند آواز سے پکار کر کہہ رہی ہے کہ ضرور یہ کسی ایسے خالق کا

فعل ہے جو بڑا حکمت والا ہے۔ (کیونکہ جب طبیعت حکیم وقادر نہ ہوئی تو ضرور یہ افعال کسی حکیم ہی کے ہوں گے کیونکہ وہ حکمت وتدبیر سے بھرے ہوئے ہیں۔)

قدماء میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو عمد وتدبیر کے منکر تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اشیاء عالم بالعرض و بالاتفاق پیدا ہو گئی ہیں۔ (یعنی بلاارادہ اتفاقاً پیدا ہو گئی ہیں۔ جیسے کسی کو زمین کھودنے سے اتفاقاً خزانہ مل جاتا ہے۔ حالانکہ کھودنے والے کا ارادہ نہیں ہوتا کہ وہ خزانے کی غرض سے زمین کھود رہا ہو) ان کی دلیل یہ تھی کہ عورتوں سے بچے خلاف عادت پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے بچہ کبھی چھ انگلیوں کا پیدا ہوتا ہے کبھی عضوِ ناقص کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ یا بدہیئت مبدل الخلق ہوتا ہے۔ اس کو انہوں نے اس بات کی دلیل ٹھہرائی تھی کہ اشیاء عالم کسی کے ارادہ وتدبیر سے وقوع پذیر نہیں ہوئیں (کیونکہ مدبر و مرید ایسا نہیں کر سکتا کہ کسی بچے میں پانچ انگلیوں کی بجائے چھ پیدا کر دے، کسی میں ایک سر کے ساتھ دوسرا بھی پیدا کر دے، کسی کو ایک ہی ہاتھ کا اور کسی کو چار ہاتھوں کا پیدا کر دے) بلکہ محض بالعرض اور اتفاقی طور پر پیدا ہوئے ہیں۔

ارسطا لیس نے ان کے کلام کو (اسی زمانے میں) رد کر دیا تھا۔ اس نے یہ جواب دیا تھا۔ ''کہ جو چیز کبھی اتفاقی طور پر ہو جاتی ہے اس کے کچھ خاص خاص اسباب ہوتے ہیں جو طبیعت کو عارض ہو جاتے ہیں اور اس کو اس کے اصلی افعال سے ہٹا دیتے ہیں۔'' (مثلاً قوت مولدہ جو رحم میں ہوتی ہے اس کا بہ سبب اپنی کمزوری کے کامل صورت پیدا کرنے سے قاصر رہنا، یا کثرت حرارت اور اضطراب فعل کی وجہ سے ایک کی جگہ دو کا ہو جانا وغیرہ)۔ تو وہ اتفاق کبھی بمنزلہ طبیعة کے نہیں ہو سکتا، جو ایک ہی طور پر برابر ہمیشہ جاری رہے حالانکہ اے مفضل! تم قسم قسم کے حیوانات کو دیکھتے ہو کہ اکثر ایک ہی صورت اور ایک ہی قانون پر چلے جاتے ہیں۔ مثلاً انسان ہی ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے دو ہاتھ

ہوتے ہیں، دو پاؤں ہوتے ہیں، پانچ انگلیاں ہوتی ہیں، جیسا کہ عام طور پر لوگوں میں موجود ہے۔ مگر (کبھی کبھی) جو اس کے برخلاف ہو جاتا ہے وہ کسی علت کی وجہ سے ہوتا ہے جو رحم یا مادے میں ہوتی ہے جس سے جنین بنتا ہے۔ جیسے صنعتوں میں ہوتا ہے کہ کاریگر تو چاہتا ہے کہ میں اس چیز کو ٹھیک اور باقاعدہ بناؤں مگر اس کے اوزاروں میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے (تو اس کی صنعت میں عیب رہ جاتا ہے)۔

اسی طرح حیوانات کے بچوں میں بھی کچھ ایسے ہی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں (جنہیں ہم نے بیان کیا) ان سے بچہ ناقص یا زائد یا بدہیئت پیدا ہوتا ہے اور اکثر باقاعدہ اور درست پیدا ہوتے ہیں جن میں کوئی عیب یا نقص نہیں ہوتا۔

پس جس طرح بعض کاموں میں کسی سبب سے کوئی خرابی واقع ہو جاتی ہے مگر موجب اہمال نہیں ہوتی اور نہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا کوئی صانع نہیں ہے۔ اسی طرح بعض امور جو افعال طبیعیہ میں کسی مانع وحارج کی وجہ سے واقع ہو جاتے ہیں وہ بھی اس بات کا سبب نہیں ہو سکتے کہ کل کے کل اتفاقاً پیدا ہوئے ہوں۔

پس جو شخص کسی امر کے برخلاف طبیعت (وقانون قدرت ظاہری) ہو جانے کی وجہ سے یہ کہتا ہے کہ تمام چیزیں بخت واتفاق سے پیدا ہو گئی ہیں اس کا یہ کلام غلط اور فاسد ہے۔

اب اگر وہ یہ کہیں کہ پھر اشیائے عالم میں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض ناقص اور بعض تام (کامل) پیدا ہوتے ہیں؟

ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ اس لیے ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اشیاء عالم کا وجود طبیعت کی مجبوری کے سبب سے نہیں ہے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اگر طبیعت کی طرف سے ہو تو سب میں مساوات ہی ہو، جیسا کہ ان کہنے والوں نے کہا ہے، بلکہ خالق حکیم کے ارادے اور تقدیر سے ایسا ہوا ہے کہ اس نے طبیعت کو ایسا بنایا کہ اکثر تو ایک ہی قاعدہ اور

قانون پر چلا کرے اور کبھی کبھی کسی سبب سے اس قانون سے ہٹ بھی جائے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ طبعیت بھی کسی غیر کے تصرف میں ہے۔ اس میں کسی غیر کی تدبیر وحکمت نے کام کیا ہے۔ یہ بھی کسی اپنے حد کے کمال تک پہنچنے اور اپنے عمل کو پورا کرنے میں خالق کے پیدا کرنے اور اس کی قدرت کی محتاج ہے۔

تبارک اللہ رب العلمین

مفضل! میں نے جو تمہیں دیا ہے اسے لے لو اور جو میں نے بخشا ہے (تعلیم کیا ہے) اسے یاد کر لو اور اپنے پروردگار کا شکر ادا کرو۔ اور اس کی نعمتوں پر حمد بجالاؤ، اس کے دوستوں کی اطاعت کرو۔

میں نے تم سے عالم کے مخلوق ہونے کی دلیلیں اور درستی تدبیر اور ارادے کے شواہد بہت سے میں سے تھوڑا سا اور کل میں سے ایک جز، بیان کیا ہے۔ اسے خیال میں رکھو اور اس میں غور وفکر کرو، اس سے عبرت حاصل کرو۔

مفضل کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی مولیٰ! انشاء اللہ آپ کی مدد سے میں اس امر پر قادر ہوں گا، اور اس مطلب تک پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت آپؑ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا اور فرمایا: ''احفظ بمشية الله و لا تنس انشاء الله'' تو میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ (اس کے سبب کو علم نفس والے خوب سمجھیں گے) جب میں ہوشیار ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

مفضل اب تم اپنے آپ کو کیسا پاتے ہو؟

میں نے عرض کیا، اپنے مولیٰ کی مدد اور تائید سے اس کتاب سے میں مستغنی ہو گیا جسے میں نے لکھا ہے اور ایسا مجھے حفظ ہو گیا ہے گویا میں اسے اپنی انگلیوں کے لکھے ہوئے سے پڑھ رہا ہوں۔

پس میرے مولیٰ (خدائے تعالیٰ) ہی کے لیے شکر وحمد ہے جس کا بس وہی مستحق ہے اور جیسا مستحق ہے۔

پھر آپؑ نے فرمایا: مفضل اپنے دل کو مطمئن کر لو اور اپنے دماغ وعقل واطمینان کو مجتمع کر لو، تو میں انشاء اللہ تم سے ملکوت، آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ملائکہ پیدا کیے ہیں اور سدرۃ المنتہیٰ تک ان کے مقامات ومراتب مقرر کیے ہیں اور تمام مخلوقات جن وانس سے لے کر زمین کے ساتویں طبقے اور تحت الثریٰ تک سب بیان کر دوں گا، تا کہ (تمہیں معلوم ہو) کہ جو کچھ تم نے اس وقت یاد کر لیا ہے وہ بہت سے جزوں میں سے ایک جز ہے۔

اچھا، اب تم چلے جاؤ، جب تمہارا جی چاہے میرے پاس آتے جاتے رہنا۔

''خداحافظ وناصر''

ہمارے نزدیک تمہارا بڑا مرتبہ ہے اور مؤمنین کے دلوں میں تمہاری قدر ایسی ہے جیسے پیاس میں پانی کی (مگر) جو میں نے تم سے وعدہ کیا ہے اس کی درخوست مجھ سے نہ کرنا۔ جب تک میں خود تم سے بیان نہ کروں۔

مفضل کہتے ہیں کہ میں حضرتؑ کے پاس سے وہ شئے لے کر واپس آیا کہ کوئی بھی ایسی شئے لے کر نہ واپس آیا ہوگا۔

'' فالحمد للہ اوّلاً واٰخراً وظاہراً وباطناً وھو علیٰ کل شئی قدیر ''